پریت کی ریت



رزاق شاہد کوہلر

ناول رزاق شاہد کوہلر

پریت کی رِیت

میں یعنی شہیر حسن راجا، جس کی دانائی، وجاہت اور دلیری پورے گاؤں میں ضرب المثل تھی۔ لوگ جس سے باتیں کرنا فخر سمجھتے تھے اور دوست جس کی دوستی پر ہمہ وقت جان چھڑکنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اُس وقت کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح گاؤں سے باہر نہر کے کنارے پیپل کے ایک گھنے درخت کے سائے میں لیٹا قسمت کی ستم ظریفی پر کڑھ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے اور دل بجھا بجھا سا تھا۔ میں کیا بلکہ اُس وقت مجھے ساری کائنات غم میں ڈوبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ پیپل کے پتوں سے لہو رستا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ آسمان پر چمکتا سورج بھی سرخی مائل رنگت اختیار کر چکا تھا۔ چاروں طرف اداسی ہی اداسی تھی۔ میری آنکھوں کے سامنے موجود ہر چیز پر جیسے غم کی کیفیت طاری تھی۔ کل تک یہی نظارے مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ پیارے تھے۔ پیپل کے درخت کی گھنی چھاؤں میں مجھے ماں کی گود جیسی آسودگی اور آرام ملتا تھا۔ نہر کا گدلا پانی میرے لیے آبِ حیات سے کم نہیں تھا۔ دُور پہاڑوں کے اُوپر سے اُٹھتے اُودے اور سفید بادل دیکھ کر میرا دل گنگنانے کو چاہنے لگتا تھا۔ لیکن آج یہ سب نظارے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ہر چیز نے سیاہ ماتمی لباس پہن لیا ہے۔ میں گزشتہ کئی گھنٹوں سے پیپل کے اُس درخت کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ خودکشی اگر حرام نہ ہوتی تو شاید میں اب تک اپنی جان

لے چکا ہوتا۔ میرے لیے اب زندگی میں کوئی کشش نہیں رہی تھی۔ لیکن مجھے جینا تھا۔ خود سے انتقام لینے کے لیے جینا تھا۔

ننگی زمین پر لیٹنے سے میرا سفید لباس خاک آلود ہو چکا تھا۔ سیاہ چمک دار بال بھی اُلجھ کر دھول میں اٹ چکے تھے۔ مگر مجھے اُس وقت کسی چیز کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں وہاں مرنے کے لیے آیا تھا۔ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی جان لینے کے لیے آیا تھا۔ لیکن پھر یہ سزا کم جان کر میں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ میں گھر سے جو مضبوط رسی لے کر آیا تھا۔ وہ بدستور میرے ہاتھوں میں تھی۔ اُسی کا پھندا بنا کر میں اپنے گلے میں ڈالنا چاہتا تھا۔ یونہی لیٹے لیٹے مجھ پر دھوپ پڑنے لگی۔ پیپل کا سایا اب آہستہ آہستہ مشرق کی طرف سرکنے لگا تھا۔ سورج کی بے رحم کرنیں میرے بدن میں چبھ رہی تھیں۔ قریبی نیم پختہ سڑک سے کتنے ہی لوگ گزرے تھے۔ لیکن کسی نے بھی مجھ سے کچھ پوچھنے یا جاننے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ ویسے بھی آج کل کسی کے پاس اتنی فرصت کہاں ہوتی ہے کہ وہ دوسرے کے مسائل حل کرتا پھرے؟ سب کو اپنی اپنی پڑی رہتی ہے۔

میں پیپل کے درخت کے نیچے کڑکتی دوپہر کے وقت پہنچا تھا اور اب سورج ڈھلنے والا تھا۔ پیپل کا سایا بڑھتے بڑھتے نہر کے وسط تک پہنچ چکا تھا۔ ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں میں اب وہ تمازت نہیں رہی تھی۔ کچھ ہی دیر میں مغرب کی اذان ہونے والی تھی۔ مگر میرا وہاں سے اُٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میری حالت اُس وقت دیوانوں جیسی تھی۔ سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیتیں جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اسی دوران پیپل کے درخت پر پرندے جمع ہونے لگے۔ وہ چہک رہے تھے۔ شور مچا رہے تھے۔ کبھی ایک شاخ پر تو کبھی دوسری پر بیٹھ رہے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اس خوب صورت منظر سے ضرور محظوظ ہوتا اور سیل فون سے اُس کی وڈیو بھی بنا ڈالتا۔ لیکن اُس وقت تو میں اپنے ہوش و حواس میں ہی نہیں تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں کہ اچانک ہی میری سماعتوں سے ایک مانوس آواز ٹکرائی۔ ”راجا میرے بیٹے! یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ اُٹھو گھر چلو بیٹے تمہاری ماں تمہارا رستا دیکھ رہی ہے۔“

وہ میرے بابا تھے۔ گاؤں کے سب سے بڑے زمین دار، جن کی زمینوں پر بیسیوں کسان کام کرتے تھے۔ بابا کی وجہ سے ہی اُن کے گھروں کے چولھے جلتے تھے۔ وہ میری تلاش میں کسی کامے کو بھی بھیج سکتے

تھے۔مگر شاید یہ بات اُن کی پدری شفقت نے گوارا نہیں کی تھی۔ میں اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔اُن کی آئندہ نسل کا وارث تھا۔لہٰذا مجھے تلاش کرتے ہوئے وہ خود ہی وہاں تک پہنچ گئے تھے۔میں نے سر اُٹھا کر بابا کی طرف دیکھا اور پھر روہانسی آواز میں کہا۔"اباجی! میں وہاں کیا کروں گا۔گھر میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

وہ بولے۔"رات ہونے والی ہے بیٹے! میں یہاں اس ویرانے میں تمہیں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ شاباش میرے بچے! اُٹھو اور گھر چلو۔"

"آپ جائیں اباجی! میں خود ہی پہنچ جاؤں گا تھوڑی دیر تک۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں جواب دیا۔

"دیکھو راجا! میرا تماشا مت بناؤ بیٹے، لوگ مجھ پر ہنسیں گے کہ ملک قدیر کا اکلوتا بیٹا ساڑھے پانچ فٹ کی ایک لڑکی کی خاطر دیوانہ بنا پھرتا ہے۔"

"وہ......وہ لڑکی نہیں تھی اباجی! میں آپ کو کیسے............"

"راجا!" بابا نے جھنجھلا کر بات کاٹی۔"تم چلتے ہو کہ میں بلاؤں تین چار بندوں کو ڈنڈا ڈولی کر کے لے جائیں گے تمہیں۔"

چار و ناچار مجھے اُٹھنا پڑا۔ورنہ بابا سے بعید نہیں تھا کہ وہ سچ مچ بندے بلا لیتے۔اُن کی جیپ کچھ فاصلے پر کچی سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی تھی۔بابا نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے تقریباً کھینچتے ہوئے جیپ کی جانب چل دیے۔جیپ کے قریب پہنچ کر اُنھوں نے فرنٹ سیٹ کی کھڑکی کھولی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔"تم کیوں میری عزت خاک میں ملانے پر تلے ہوئے ہو؟"

"اباجی! میں اُس کے بغیر نہیں جی سکتا۔" میں نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"میں اُسے حاصل کر کے رہوں گا ورنہ خودکشی کر لوں گا۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ اب وہ کسی کی امانت ہے۔خبردار اگر تم نے کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کی تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔" بابا نے اگنیشن میں چابی لگاتے ہوئے جیپ اسٹارٹ کی اور پھر گیئر لگاتے ہوئے آگے بڑھا دی۔

"کاش اباجی! میں آپ کو سمجھا سکتا۔" میں نے ایک آہ خارج کرتے ہوئے کہا۔"کہ.......میں.......میں

اُس سے..........‘‘

’’بس۔‘‘ بابا نے قطع کلامی کی۔’’چُپ چاپ بیٹھے رہو۔زیادہ مجنوں بننے کی کوشش مت کرو۔خود بھی چین سے جیو اور اُس بے چاری کو بھی چین سے جینے دو۔‘‘

بابا کا موڈ دیکھ کر میں وقتی طور پر خاموش ہو گیا۔وہ چِٹے ان پڑھ تھے اور میں اُنھیں سمجھانے سے قاصر تھا۔لہٰذا چُپ رہنے ہی میں میری بھلائی تھی۔میں یہ گفت گو کسی اور مناسب موقع پر چھیڑ سکتا تھا۔جب ہماری جیپ حویلی کا پھاٹک کراس کرتے ہوئے اندر داخل ہوئی تو اُس وقت تک ملگجا سا اندھیرا اچھیل چکا تھا۔

☆......☆......☆

میں وسطی پنجاب کے ایک معروف گاؤں کا رہنے والا تھا۔جہاں زندگی کی بیش تر سہولیات میسر تھیں۔لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ ہائیر سیکنڈری سکول تھے۔گاؤں کی گلیاں پختہ تھیں۔بجلی میری پیدائش سے پہلے کی موجود تھی۔تیس ہزار نفوس پر مشتمل وہ گاؤں اب ایک قصبے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔چنانچہ کسی بھی وقت صاحبانِ اقتدار اُسے تحصیل کا درجہ دے سکتے تھے۔بچپن مجھے اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو وہ سکول تھا۔جہاں گاؤں کے بچے صبح سے لے کر دوپہر تک قید رہتے تھے۔میں اُن بچوں کی حالت دیکھ کر محظوظ ہوا کرتا تھا۔قہقہے لگایا کرتا تھا کہ اچانک ایک روز وہ قہقہے میرے حلق میں اٹک کر رہ گئے۔اُس روز ناشتا کرتے ہوئے بابا نے اماں سے کہا۔’’راجا کی عمر اب پانچ برس سے تجاوز کرنے والی ہے۔میں چاہتا ہوں کہ اب یہ سکول میں داخل ہو جائے۔‘‘نام تو میرا شہیر حسن تھا۔مگر اماں اور بابا مجھے پیار سے راجا کہا کرتے تھے۔چنانچہ لفظ راجا باقاعدہ میرے نام کا حصہ بن گیا تھا۔

اماں بولیں۔’’میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ اسے اب سکول جانا چاہیے۔دن بھر آوارہ گردی کرتا رہتا ہے۔‘‘

’’میں سکول نہیں جاؤں۔‘‘میں نے مداخلت کی۔’’ماسٹر جی بچوں کو بہت مارتا ہے۔اُنھیں مرغا بنا کر بانگ دینے کو کہتا ہے۔‘‘

’’تو مرغا بنا کون سا مشکل ہے بھئی؟‘‘ بابا مسکرائے۔’’البتہ یہ بانگ دینے والا مسئلہ مجھے کچھ ٹیڑھا لگتا ہے۔خیر کوئی بات نہیں اپنے ساتھیوں کو دیکھ دیکھ کر تم بھی بانگ دینا سیکھ جاؤ گے۔یہ کوئی اتنا مشکل کام

نہیں ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا ابا جی! مجھے ماسٹر سے ڈر لگتا ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

اماں تنگ کر بولیں۔" ارے ماسٹر کوئی بھالو باندر ہے کہ تم اُس سے ڈرتے ہو۔تمہارے ابا جی کی طرح وہ بھی ایک انسان ہی ہے۔"

"میری مثال دینے کی کیا ضرورت تھی احمق عورت؟" بابا ایک دم اماں پر بگڑ گئے۔" تم اپنے کسی بھائی کی مثال بھی تو دے سکتی تھیں؟"

"دیکھ ملک قدیر!" اماں کو بھی غصہ آ گیا۔" یہ تم ہر موقع پر میرے بھائیوں پر کیوں چڑھ دوڑتے ہو، اُنھوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟"

" خود کو لگی تو درد محسوس ہوا نا!" بابا طنزیہ انداز میں ہنس دیے۔" اب تم مثال دینے سے پیشتر ضرور سوچا کرو گی۔"

" ارے بیٹا تمہارا اسکول نہیں جا رہا اور قصور میرے بھائیوں کا ہو گیا؟ کچھ خدا کا خوف کرو ملک صاحب! میرے شریف بھائیوں کو ہر معاملے میں کیوں گھسیٹ لاتے ہو، اُنھوں نے کون سی زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ؟"

"کیوں......تمہارے بھائی کیا گنگا نہائے ہوئے ہیں؟" بابا نے قہقہہ لگایا۔" کئی بار مجھ سے اُدھار لے گئے ہیں۔مگر خدا کے بندے قرض واپس نہ کرنے میں پکھا ایسے مستقل مزاج ہیں کہ قرض خواہ اُن کی صورت دیکھنے کو ترس جاتا ہے۔عید کا چاند تو پھر بھی سال بھر کے بعد نظر آ جاتا ہے مگر تمہارے بھائی مجال ہے کہ کبھی اپنی جھلک بھی دکھا دیں۔مجھے تو اُن کی شکلیں تک بھول جاتی ہیں۔"

"بس بس زیادہ دانت مت نکالو، اب میرے بھائی اتنے بھی بُرے نہیں ہیں کہ تم ہاتھ دھو کر صبح شام اُن کے پیچھے پڑے رہو؟"

بابا بولے۔" ارے میں نے کب کہا ہے کہ وہ اتنے بُرے ہیں۔بلکہ وہ تو بہت زیادہ بُرے ہیں۔"

اماں اور بابا کو ایک دوسرے کے ساتھ اُلجھا دیکھ کر میں چپکے سے کھسک گیا۔حویلی کی بلند و بالا ڈیوڑھی سے گزرتا ہوا میں گلی میں داخل ہوا اور پھر پیچھے دیکھے بغیر خالہ کلثوم کے گھر کی جانب دوڑ لگا دی۔خالہ کلثوم اماں کی سگی بہن تھیں۔وہ چند سال اماں سے چھوٹی تھیں۔اُن کی ایک ہی بیٹی تھی۔جس کا نام یاسمین تھا۔یاسمین اور میری عمر تقریباً برابر تھی۔وہ بھی میری طرح ابھی سکول میں داخل نہیں ہوئی تھی۔چنانچہ سارا دن حویلی کے باغ میں گڑیا گڈے کا کھیل کھیلتی رہتی تھی۔کبھی کبھار میں بھی اُس کے ساتھ یہ کھیل کھیلتا رہتا تھا۔مگر مجھے اس کھیل میں کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔کیونکہ یہ خالص لڑکیوں کا کھیل تھا۔تاہم یاسمین سے ایک اُنس ہونے کی وجہ سے میں نہ چاہتے ہوئے بھی یاسمین کی فرمائش پر یہ کھیل کھیل لیتا تھا۔

اُس روز میں جونہی اُن کی حویلی میں داخل ہوا تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔خالہ کلثوم یاسمین کے بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔جب کہ یاسمین نے سکول کی یونی فارم پہنی ہوئی تھی۔میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُن کے قریب پہنچ گیا۔خالہ نے مسکرا کر میری جانب دیکھا اور پھر پوچھا۔"شیطان کے چیلے!کیا تمہیں آپا نے سکول میں داخل نہیں کرایا؟"

میں نے کہا۔"خالہ!میں سکول کے ڈر سے تو یہاں بھاگ آیا ہوں۔اماں اور بابا دونوں مجھے سکول بھیجنے پر بضد ہیں۔مگر میں سکول نہیں جاؤں گا۔"

"سکول نہیں جاؤ گے تو کیا ڈھور ڈنگر چراؤ گے؟"خالہ نے مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں کروں گا۔بس کھیلوں گا۔"

"کس کے ساتھ کھیلو گے؟یاسمین تو آج سکول جا رہی ہے۔اس کے ابا آج اسے سکول میں داخل کرائیں گے۔"خالہ نے یاسمین کی چٹیا باندھتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے کہا۔"یاسمین!تم سکول مت جاؤ،تمہیں اُستانی مارے گی۔آؤ ہم دونوں باغ میں کھیلتے ہیں۔"

"نہیں میں تو سکول ضرور جاؤں گی۔تمہیں کھیلنا ہے تو کھیلو لیکن میں تمہارے ساتھ نہیں آسکتی۔"یاسمین سے جھٹ سے جواب دیا۔

"اگر تُو سکول گئی تو میں تمہاری گڑیا کا گلا کاٹ دوں گا۔"میں نے دھمکی دی۔

خالہ مجھے ڈراتے ہوئے بولیں" چل بھاگ بدمعاش کہیں کے! یاسمین کے ابا آ گئے تو تیرے کان کاٹ دیں گے۔"

تھوڑی دیر کے بعد یاسمین اپنے ابا کے ساتھ سکول کی طرف روانہ ہوگئی۔ جب کہ میں اُن کے باغ کی طرف چل دیا۔ چند لمحے تو میں باغ میں تتلیوں اور پرندوں کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اس کے بعد تھک کر ایک سنگی بنچ پر بیٹھ گیا۔ باغ، تتلیاں اور پرندے سب وہی تھے۔ لیکن آج مجھے کھیلنے کا لطف نہیں آرہا تھا۔ میرے ننھے سے دماغ میں پہلی بار یہ سوال اُٹھا کہ " تم یاسمین کے بغیر ادھورے ہو۔" چنانچہ میں افسردگی کے عالم میں وہاں سے اُٹھا اور گھر کی جانب چل دیا۔ پہلی بار مجھے شدت سے یاسمین کی کمی کا احساس ہورہا تھا۔

☆......☆......☆

دوسرے روز اماں نے مجھے زبردستی سکول یونی فارم پہنا کر میری پشت سے سکول بیگ لٹکایا، بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کی اور پھر میرا بازو بابا کو پکڑاتے ہوئے بولیں۔ " ملک صاحب! لو راجا کو میں نے تیار کردیا ہے۔ اب اسے سکول میں داخل کرانا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

بابا نے مسکرا کر کہا۔ " تم فکر ہی نہ کرو بھئی! میرا راجا بیٹا تو سولہ جماعتیں پاس کرے گا۔ تم دیکھنا ایک دن یہ بہت بڑا افسر بنے گا۔"

" ابا جی! مجھے سکول نہیں جانا۔" میں نے اچانک رونا شروع کردیا۔ " مجھے افسر بھی نہیں بننا۔ ماسٹر بہت مارتا ہے۔ میں نے سکول نہیں جانا۔ بالکل نہیں جانا۔"

" دیکھ راجا!" بابا مجھے زبردستی کھینچتے ہوئے حویلی کے پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے بولے۔ " سکول تو تجھے ہر حال میں جانا ہی پڑے گا۔ خوشی سے جاؤ گے تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ ورنہ دوسری صورت میں مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔"

میں نے ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کی۔ مگر بابا کی مضبوط گرفت سے خود کو آزاد کرانے میں ناکام رہا۔ چنانچہ جھنجلا کر میں نے بلند آواز سے رونا شروع کردیا۔ لیکن بابا نے میرے رونے کی کوئی پرواہ نہ کی۔ وہ مجھے یوں ہی گھسیٹتے ہوئے ڈیوڑھی میں کھڑی ہوئی جیپ تک پہنچے .... مجھے

اُٹھا کر سیٹ پر بٹھایا اور پھر خود بھی میرے

ساتھ بیٹھ گئے۔ دوسرے ہی لمحے جیپ اسٹارٹ ہو کر ڈیوڑھی کا پھاٹک کراس کرتے ہوئے گلی میں پہنچ گئی۔ میں بدستور دھاڑیں مار کر رو رہا تھا۔ بابا سے التجا کر رہا تھا۔ مگر وہ ٹس سے مس بھی نہیں ہو رہے تھے۔ سکول گاؤں سے باہر جانے والی پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا۔ بابا گاؤں کی گلیوں سے گزرتے ہوئے پندرہ منٹ کے اندر سکول کے مین گیٹ تک پہنچ گئے۔ گاڑی کا انجن آف کرنے کے بعد اُنھوں نے مجھے بازوؤں میں اُٹھایا اور سکول کے اندر داخل ہو گئے۔

ماسٹر جی بابا کو دیکھتے ہی آگے بڑھے اور جھٹ سے سلام کر دیا۔ بابا نے ماسٹر جی کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ماسٹر جی! یہ میرا اکلوتا بیٹا شہیر حسن ہے مگر ہم اسے پیار سے راجا کہتے ہیں۔ اب آج سے یہ آپ کے حوالے ہے۔ میں اسے سکول سے غیر حاضر دیکھنا نہیں چاہتا۔''

ماسٹر جی بولے۔ ''بے فکر رہیں ملک صاحب! میں اپنی ذمہ داری نبھانا اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کو شکایت کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔''

''بہت اچھے ماسٹر جی! تو پھر بسم اللہ کیجیے اسے آج ہی داخل کرنا ہے۔''

''تو پھر آیئے ملک صاحب! میرے دفتر میں بیٹھتے ہیں۔ برخوردار کو داخل کرنے کے ساتھ ساتھ چائے بھی پی لیں گے۔''

بابا بولے۔ ''اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے ماسٹر جی! میں گھر سے چائے پی کر ہی نکلا ہوں۔''

''نہیں نہیں ملک صاحب!'' ماسٹر جی بضد ہوئے۔ ''چائے تو آپ کو پینا ہی پڑے گی۔ میرا ایک شاگرد بہت اچھی چائے بناتا ہے۔''

ماسٹر جی نے ایک لڑکے کو آواز دے کر بلایا اور جیب سے ایک نوٹ نکال کر اُسے دیتے ہوئے بولا۔ ''بھاگ کر جا بیٹا اور جلدی سے دودھ لے آ۔''

لڑکا نوٹ لے کر بازار کی جانب بھاگ کھڑا ہوا جب کہ میں اور بابا ماسٹر جی کے دفتر میں داخل ہو گئے۔

''تشریف رکھیے ملک صاحب۔'' ماسٹر جی نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور بابا ''شکریہ'' کہہ کر بیٹھ گئے۔

ماسٹر جی نے دیوار میں پیوستہ چوبی الماری سے ایک فارم نکالا اور پھر بابا سے پوچھ کر میرے کوائف درج کرنے لگا۔اس کے بعد ماسٹر جی نے بابا سے فارم پر انگوٹھا لگواتے ہوئے کہا۔" لیجیے ملک صاحب ! برخوردار اب باقاعدہ پہلی جماعت میں داخل ہو گئے ہیں۔"

بابا نے جیب سے پانچ سو روپے کا ایک نوٹ نکالا اور ماسٹر جی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولے۔" آپ کی بہت مہربانی ماسٹر جی! یہ میری طرف سے مٹھائی سمجھیے گا۔"

"نہیں نہیں.....ملک صاحب! اس کی کیا ضرورت ہے۔" ماسٹر جی نے انکار میں سر ہلایا۔" گورنمنٹ ہمیں تنخواہ دیتی ہے۔تو پھر..........."

"ماسٹر جی! میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں۔" بابا نے قطع کلامی کی۔" یہ آپ کی مٹھائی ہے خدانخواستہ کوئی رشوت تو نہیں ہے؟ میرے بیٹے کا آج سکول میں پہلا دن ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔انکار کر کے میرا دل نہ توڑیے۔"

بابا کے خلوص کو دیکھ کر ماسٹر جی نے نوٹ لے کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔اس کے بعد بابا کو چائے پیش کی گئی۔اُنھوں نے چائے پی اور مجھے پیار کرتے ہوئے رخصت ہو گئے۔بابا کے رخصت ہوتے ہی ماسٹر جی نے مجھے بازو سے پکڑا اور پہلی جماعت کے بچوں کے ساتھ بٹھا دیا۔میں دوپہر تک بچوں کے ساتھ بیٹھا الف ب ت ث پڑھتا رہا اور دل ہی دل میں اماں اور بابا کو بددعائیں دیتا رہا۔جنھوں نے میری اچھی بھلی آزاد زندگی کو قید میں بدل دیا تھا۔اسی دوران آدھی چھٹی کا وقت ہو گیا۔جونہی گھنٹی بجی بچے اپنی اپنی تختی لے کر اچھلتے کودتے سکول سے باہر نکل گئے۔جب سب بچے کمرے سے نکل گئے تو تب میں نے اپنا سکول بیگ اُٹھا کر کندھے سے لٹکایا، تختی کو ہاتھ میں پکڑا اور ماسٹر جی کی نگاہوں سے بچتا بچاتا سکول سے باہر نکل گیا۔

اماں مجھے بیگ سمیت گھر میں داخل ہوتا دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئی، پھر پوچھا۔" کیوں راجا! کیا تم سکول سے بھاگ آئے ہو؟"

"ہاں بھاگ آیا ہوں۔" میں نے غصے سے سکول بیگ اور تختی زمین پر پھینکتے ہوئے کہا۔" میں نہیں پڑھوں گا۔بالکل نہیں پڑھوں گا۔"

”بُری بات ہے بیٹے! ایسا نہیں کہتے۔ پڑھنا لکھنا تو بہت اچھی بات ہے۔ تم پڑھ لکھ کر افسر بن جاؤ گے تو لوگ تمہاری عزت کریں گے۔“

”نہیں اماں!“ میں اُن کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ ”آپ اباجی کو سمجھائیں نا! میں پڑھنا نہیں چاہتا۔“

اماں بولیں۔ ”گاؤں کے اور بچے بھی تو سکول جاتے ہیں۔ وہ بھی تو تمہاری ہی عمر کے ہیں۔ وہ کیوں اپنی ماؤں سے ضد نہیں کرتے؟“

”اماں! میں نے کہہ دیا ہے کہ میں سکول نہیں جاؤں گا تو بس نہیں جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے تم سکول نہیں جاؤ گے تو میں تجھے کھانا نہیں دوں گی۔“ اماں نے دھمکی دی۔ ”اور رات کو کہانی بھی نہیں سناؤں گی۔“

” مجھے نہیں سننی کہانی اور کھانا میں خالہ کلثوم کے گھر سے کھا لیا کروں گا۔“ میں نے منہ پھلا کر جواب دیا اور پھر اماں کی بات سنے بغیر خالہ کے گھر کی طرف بھاگ گیا۔

دوسرے دن صبح سویرے اماں نے مجھے جگانے کی کوشش کی مگر میں نے اُٹھنے سے انکار دیا۔ مجبوراً اماں کو بابا کی مدد لینی پڑی۔ بابا نے مجھے زبردستی جگایا۔ اور ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم سکول نہیں جاؤ گے تو پھر میں تجھے مویشی چرانے پہ لگا دوں گا۔“

”میں مویشی چرا لوں گا لیکن سکول نہیں جاؤں گا۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے اگر تمہاری یہی مرضی ہے تو پھر یوں سہی۔“ بابا نے جواب دیا اور پھر اماں سے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد حویلی سے متصل مہمان خانے کی طرف چل دیے۔ وہاں شاید کچھ کسان اُن سے کوئی بات کرنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔

☆......☆......☆

دن کے نو بجے میں اپنے چچیرے بھائیوں کے ساتھ گاؤں سے لگ بھگ تین کلومیٹر دور اپنے کھیتوں میں تھا۔ تیس کے قریب گائے بھینسیں اور بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ ہمارے پاس تھا۔ چچیرے بھائیوں میں سے ایک مجھ سے چھ سات برس بڑا تھا۔ جب کہ دوسرا میرا ہم عمر تھا۔ کھلی فضا اور سرسبز درختوں کی چھاؤں میں یہ کام سکول

کی نسبت میرے لیے آسان تھا۔نہر ہمارے کھیتوں کے عین درمیان سے گزر رہی تھی۔چنانچہ دوپہر کے وقت مویشیوں کو درختوں کے نیچے بٹھا کر ہم نے نہر میں نہانا شروع کر دیا۔اُس روز ہم تینوں خوب کھیلے کودے اور کشتی بھی لڑتے رہے۔میں بہت خوش تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ سکول کی قید سے میری جان چھوٹ گئی تھی۔دن ڈھلے جب ہم مویشی لے کر گھر پہنچے تو بابا اور اماں مجھے ہشاش بشاش اور خوش دیکھ کر قدرے پریشان سے ہو گئے۔

دوسرے روز جب ہم ڈھور ڈنگر لے کر کھیتوں میں پہنچے تو میں نے چچیرے بھائیوں کے انداز میں واضح تبدیلی محسوس کی۔پہلے تو بہانے بہانے سے اُنھوں نے مجھے پیٹا۔اس کے بعد بڑا بھائی تحکمانہ لہجے میں بولا۔

”راجا! آج مویشیوں کا دھیان تم رکھو گے۔خبردار اگر کسی اور کے کھیت میں مویشی گھسے تو میں تجھے بہت ماروں گا۔“

”نہیں رفیق بھائی! میں یہ نہیں کر سکتا۔“ میں نے انکار میں سر ہلایا۔”مویشی تم دونوں چراؤ گے اور میں نہر میں نہاؤں گا۔“

”کیا کیا.......؟“ رفیق بھائی نے سرخ سرخ آنکھیں نکالیں۔”ذرا پھر سے کہنا۔“

میں نے کہا۔”مجھے آنکھیں مت دکھاؤ رفیق بھائی! میں نہیں ڈرتا کسی سے۔“

”اوئے لاٹ صاب!“ چھوٹے شفیق نے مداخلت کی۔”ہم تمہارے باپ کے نوکر نہیں ہیں کہ تم لوگوں کے مویشی چراتے پھریں۔اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو اپنے مویشی الگ کر لو۔ہم اپنے چرائیں گے،تم اپنے چرانا۔“

”تُو بیچ میں مت بول شفیقے۔“میں چلایا۔”میں تجھ سے نہیں فیقے سے بات کر رہا ہوں۔“

”اچھا......تو اب میں رفیق بھائی سے فیقا ہو گیا۔“ وہ مجھے تھپڑ جڑتے ہوئے بولا۔”تُو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو؟“

”اور مار بھائی اسے اور مار۔“شفیق نے خوشی کے عالم میں قہقہہ لگایا۔

ذلت اور غصے کے احساس سے میرا دماغ اُلٹ گیا۔میں نے مٹی کا ایک سخت سا ڈھیلا اُٹھایا اور تاک کر شفیق کو مارا۔ڈھیلا سیدھا اُس کے پیٹ سے میزائل کی طرح ٹکرایا اور وہ درد کی شدت سے چیختا ہوا دوہرا ہو گیا۔بھائی

کو روتے دیکھ کر رفیق نے مجھے پکڑ کر بے دردی سے پیٹنا شروع کر دیا۔ چند لمحے تو میں چُپ چاپ مار کھاتا رہا۔ پھر اچانک رفیق کو ٹانگوں سے جکڑ لیا۔ اُسے شاید مجھ سے اس جرأت کی توقع نہیں تھی۔ میں نے اُس کی دونوں ٹانگیں زور لگا کر اپنی طرف کھینچیں تو اُس کا توازن بگڑ گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ کولہوں کے بل زمین بوس ہو گیا۔ یہ میرے لیے سنہری موقع تھا۔ چنانچہ ٹانگیں چھوڑ کر میں اُس کی گردن سے لپٹ گیا۔ وہ چیخ چیخ کر مجھے گالیاں دینے لگا۔ تبھی اُس کا ایک کان میرے دانتوں میں آ گیا۔ میں نے غصے میں آ کر اُس کے کان پر اتنی زور سے کاٹا کہ وہ درد کی شدت سے گلا پھاڑ کر چیخنے لگا۔ ''ہائے ماں! میرا کان...... اُف میں مر گیا...... ہائے میں مر گیا۔''

چیختے چیختے اُس نے شفیق سے کہا۔ ''اُلو کے پٹھے! تماشا دیکھنے کے بجائے اسے مارتے کیوں نہیں؟ چھڑی اُٹھاؤ اور اس کی پیٹھ پہ برسانا شروع کر دو۔''

میں نے کہا۔ ''شفیقے! اگر تم میرے نزدیک بھی آئے تو میں تمہاری ناک چبا ڈالوں گا۔''

وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ اسی دوران میں نے رفیق کا دوسرا کان پکڑ لیا۔ اُس کے مضروب کان سے خون رسنے لگا تھا اور اُس کی مدافعت دم توڑ چکی تھی۔ میں اُس کے دوسرے کان پر گل بوٹے کاڑھنے ہی والا تھا۔ کہ ایسے ہی وقت ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے گردن سے پکڑ کر رفیق کے اُوپر سے کھینچ لیا۔ میں نے مچل کر خود کو چھڑانے کی کوشش کی تو ایک بارعب آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ ''پاگل ہو گئے ہو کیا؟''

آواز سن کر میرا سارا جوش و خروش بھاپ بن کر اُڑ گیا۔ وہ چاچا نذیر تھا۔ بے حد اکھڑ اور غصیلی، بابا کے علاوہ خاندان کے تقریباً تمام لوگ اُس سے دب کر رہتے تھے۔ ایک بابا تھے۔ جن سے چاچا نذیر کبھی پنگا لینے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ بابا کی ہر بات پہ سر تسلیم خم کرنا چاچا نذیر کی مجبوری تھی۔ بابا جان نا صرف چاچا نذیر سے عمر میں بڑے تھے۔ بلکہ مزاج کے بھی اُس سے تیز تھے۔ چنانچہ بابا کے سامنے وہ کبھی دم مارنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔

''چاچا! ان دونوں نے مجھے بہت مارا ہے۔'' میں نے منہ بسورتے ہوئے شکایت کی۔

وہ بولا۔ ''راجا! تمہاری بدمعاشی کا نظارا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ تم نے یہ رفیق کی کیا حالت بنا دی ہے۔ مجھے اگر بھائی جان کا پاس نہ ہوتا تو آج میں تمہاری درگت بنا دیتا۔ چلو اب معافی مانگو بھائی سے۔''

”چاچا! پہل ان دونوں نے کی تھی۔ بے شک آپ ان سے پوچھ لیں۔“

”چاچا! یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ رفیق نے مداخلت کی۔”اس نے مجھے کان پہ کاٹا ہے۔ یہ دیکھیں۔ اگر آپ نہ پہنچتے تو یہ میرا کان ہی اُکھاڑ دیتا۔“

”نہیں چاچا! پہلے اس نے مجھے تھپڑ مارا تھا۔“ میں اپنا دفاع کرتے ہوئے چلایا۔”یہ دو تھے اور میں ایک۔“

”چاچا! اس نے مجھے بھی پیٹ میں مٹی کا اتنا بڑا ڈھیلا مارا ہے۔“ شفیق نے ہاتھوں سے ڈھیلے کا سائز بتاتے ہوئے شکایت کی۔

”اس کا فیصلہ بھائی جان کریں گے کہ تم میں سے قصوروار کون ہے؟ ابھی میں رفیق کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔ اور خبردار اب تم دونوں نے لڑنا نہیں ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔“ چاچا نذیر نے حکم سنایا۔

”نہیں چاچا!“ شفیق چلایا۔”میں اس کے ساتھ نہیں رہوں گا۔ ورنہ یہ میری ناک چبا ڈالے گا۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے۔“

نہ چاہتے ہوئے بھی چاچا نذیر قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔ پھر بولا۔”نہیں شفیق پتر! اب یہ بدمعاش تجھے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔“

چاچا نذیر نے رفیق کو گھوڑی پہ بٹھایا اور گاؤں کی طرف چل پڑا۔

اب وہاں میری حکم رانی تھی۔ چنانچہ میں سارا دن نہر میں نہاتا رہا اور شفیق بیچارا مویشی چراتا رہا۔ خوف کے مارے وہ میرے قریب بھی نہیں پھٹکا تھا۔ اُس دن پہلی بار مجھے شدت کے ساتھ یہ احساس ہوا تھا کہ دنیا میں صرف اور صرف طاقت کا راج چلتا ہے۔ یہاں بزدل کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ جو اپنے حق کے لیے لڑنا نہیں جانتا دنیا اُس کی کوئی بات نہیں سنتی۔

☆......☆......☆

اُس روز جب میں اور شفیق دن ڈھلے گھر پہنچے تو غیر متوقع طور بابا اور اماں نے مجھ سے کسی قسم کی پرسش نہ کی۔ یہ بات میرے لیے باعث حیرانی تھی کہ چاچا نذیر اور تایا صغیر بھی خاموش ہی رہے تھے۔ حالانکہ رفیق اور شفیق تایا صغیر کے بیٹے تھے۔ تایا صغیر کو تو یہ حق حاصل تھا کہ وہ مجھے ڈانٹتے اور جھڑکتے۔ مجھ سے باز پرس کرتے

کہ میں نے اُن کے بیٹے کا کان زخمی کر دیا تھا۔تھوڑی دیر تک تو میں سہا رہا کہ شاید مجھ سے رات کے وقت باز پرس ہو گی۔مگر جب ایسے کوئی آثار نظر نہ آئے تو متوقع خوف کو میں نے سر سے جھٹک دیا۔

اگلے روز جب ہم مویشی اور بھیڑ بکریوں کا ریوڑ لے کر کھیتوں میں پہنچے تو میں حسب معمول نہر کے کنارے ایک گھنے درخت کے نیچے بیٹھ کر گیلی مٹی سے کھلونے بنانے لگا۔وہ دونوں بھائی مجھ سے دُور رہ کر مویشی چراتے رہے۔اُنھوں نے مجھے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔میں دوپہر تک کھیلتا رہا اس کے بعد قمیص اُتار کر نہر میں نہانے لگا۔آخر کچھ دیر کے بعد میں اس شغل سے بھی اُکتا گیا۔تب میں نہر سے باہر نکلا، ساتھ لایا ہوا کھانا کھایا اور پھر وہیں سونے کے لیے لیٹ گیا۔وہ دونوں بھائی مجھ سے دُور ایک دوسرے درخت کے نیچے بیٹھے کوئی کھیل کھیل رہے تھے۔کچھ دیر تک تو میں اُنھیں غور سے دیکھتا رہا۔اس کے بعد پتا ہی نہ چلا اور میری آنکھ لگ گئی۔نجانے میں کتنی دیر تک سویا رہا کہ معاً مجھے دائیں کان کی لو میں درد کا احساس ہوا اور میں فوراً جاگ گیا۔درد کرنے والے کان کی طرف ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک بڑا سا چیونٹا ہے۔جو بڑی بے دردی کے ساتھ میرے کان کی لو سے چمٹا ہوا ہے۔میں نے غصے میں آ کر اُسے کھینچ کر زمین پر پھینکا اور پھر پاؤں سے مسل دیا۔

چند لمحے میں بیٹھا رہا اور پھر دوبارہ سو گیا۔چونکہ میں کچی نیند سے جاگا تھا۔اس لیے جلد ہی میری آنکھ دوبارہ لگ گئی۔مگر مجھے سونا نصیب نہ ہو سکا۔ایک بار پھر مجھے کان کی لو میں درد محسوس ہوا اور میں ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا۔اب کی بار چیونٹا میرے بائیں کان سے چمٹا ہوا تھا۔میں نے اُس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جیسا پہلے چیونٹے کے ساتھ کیا تھا۔چند لمحے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں ایک بار پھر سو گیا۔لیکن اب کی بار چونکہ میرے دماغ پہ چیونٹا سوار تھا۔سو کوشش کے باوجود مجھے نیند نہیں آ رہی تھی ......میں کتنی ہی دیر آنکھیں موندے پڑا رہا مگر نیند چیونٹے کے خوف کی نذر ہو چکی تھی۔معاً مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی میرے بالکل قریب موجود ہے۔میں نے ایک دم آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ رفیق تھا۔اُس نے ہاتھ میں ایک موٹا تازہ چیونٹا پکڑ رکھا تھا اور اُس کے دہن پر تھوک کر اُسے مشتعل کر رہا تھا۔چونکہ اُس کی تمام تر توجہ چیونٹے کی طرف مبذول تھی۔اس لیے وہ یہ دیکھ ہی نہ سکا کہ میں جاگ رہا ہوں۔

اُس نے مشتعل چیونٹے کو جب میرے کان کی طرف بڑھایا تو مجھے جاگا دیکھ کر وہ بوکھلا گیا اور چیونٹا پھینک

کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''فیکے ! میں تو تجھے بہت بہادر سمجھتا تھا۔ مگر تُو تو بہت بزدل ہے۔ سوئے ہوئے انسان پر وار کرنا انتہائی کمینی حرکت ہے۔''

''دیکھ راجا!'' وہ اُلٹے قدموں پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ ''میرے نزدیک مت آنا ورنہ بہت ماروں گا۔''

''کل بھی تم نے مجھے یہی دھمکی دی تھی۔ مجھے لگتا ہے آج تمہارے دوسرے کان کی باری ہے۔'' میں آگے بڑھا۔

وہ چلایا۔ ''قسم سے راجا! میں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر نہیں کیا۔ بلکہ ایسا کرنے کو مجھے چاچا جی نے کہا تھا۔''

''نذیر چاچا نے؟'' میں نے متحیر انداز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تیرے ابا جی نے بولا تھا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' میں نے جھک کر ایک موٹا سا مٹی کا ڈھیلا اُٹھا لیا۔ ''میرے ابا جی ایسا کبھی بھی نہیں کہہ سکتے۔''

''میں.........میں سچ کہتا۔'' وہ خوف زدہ ہو کر چلایا۔ ''میں کوئی بھی قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔''

''مجھے تمہاری جھوٹی قسموں پہ اعتبار نہیں ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں پیر حشمت شاہ کے قرآنِ مجید کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہی سچ ہے۔''

میں کش مکش کا شکار ہو گیا۔ اُس نے بہت بڑی قسم کھائی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اُس کی بات پر اعتبار کر لوں۔ کیونکہ گاؤں کا کوئی بھی بچہ پیر حشمت شاہ کے قرآنِ مجید کی جھوٹی قسم نہیں کھا سکتا تھا۔ بلکہ کچھ ضعیف عقیدہ کے بڑے لوگ بھی ایسا کرنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ پورے گاؤں کے بچوں میں یہ بات مشہور تھی۔ کہ پیر حشمت شاہ کے پاس ایک خاص قرآنِ مجید موجود ہے جو عام لوگوں کے گھروں میں موجود قرآنِ مجید سے مختلف ہے۔ اس لیے بچے گھر میں موجود قرآنِ مجید کی قسم تو کھا لیتے تھے۔ مگر پیر حشمت شاہ کے قرآنِ مجید کی قسم کھاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ پیر حشمت شاہ کے قرآنِ مجید کی قسم وہی بچہ کھاتا تھا۔ جو سچا ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے مجھے تم پر اعتبار ہے۔ لیکن اب تمہیں دوبارہ قسم کھانا پڑے گی۔''

''دوبارہ قسم........لیکن کیوں........کس لیے؟'' اُس کے چہرے پر تحیر تھا۔

''وہ یہ کہ آئندہ تم ایسی حرکت نہیں کرو گے۔''

''ٹھیک ہے۔'' اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے قرآن پاک کی قسم میں دوبارہ ایسا نہیں کروں گا۔''

''نا'' میں نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔ ''تمہیں پیر حشمت شاہ کے قرآن پاک کی قسم کھانا ہوگی۔''

وہ لمحہ بھر کے لیے پریشان ہوگیا۔ مگر جب میں نے ڈھیلے سے اُس کا نشانہ لیا تو اُس نے بلا تردد قسم کھالی۔

☆......☆......☆

میں تین ماہ تک بڑی خوشی اور لگن کے ساتھ ڈھور ڈنگر چراتا رہا۔ اماں اور بابا اب میری طرف سے مکمل مایوس ہو چکے تھے۔ اُنھیں معلوم ہوگیا تھا کہ میں مرتا مر جاؤں گا لیکن سکول جانا گوارا نہیں کروں گا۔ میں چونکہ اُن کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے وہ میرے مستقبل کے لیے اکثر پریشان رہا کرتے تھے۔ ایک رات وہ مجھے سوتا سمجھ کر اسی موضوع پر بات کرنے لگے۔

اماں بولی۔ ''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ راجا کا کیا کیا جائے؟ کیا یہ عمر بھر ڈھور ڈنگر چراتا رہے گا؟''

بابا بولے۔ ''رقیہ! میں اپنی سی کوشش کر چکا ہوں۔ اب اور کیا کروں؟ رفیق اور شفیق میرے ہی کہنے پر اسے ستاتے رہے ہیں۔ لیکن راجا شاید بہت ہی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا ہے۔ وہ دونوں بھائی سارا سارا دن اسے تنگ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے کانوں پر رفیق نے کئی بار چیونٹے چھوڑے مگر یہ چیونٹوں کے کاٹنے سے بھی نہیں ڈرا۔ اب تو کوئی معجزہ ہی اسے سکول جانے پر مجبور کر سکتا ہے۔''

وہ دیر گئے تک اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے.....اُس رات مجھے بابا پر بہت غصہ آیا مگر میں چپ رہا۔ البتہ میں نے دل ہی دل میں یہ عہد ضرور کر لیا تھا۔ کہ بابا چاہے کچھ بھی کرلیں میں سکول نہیں جاؤں گا۔

وہ گرما کے دن تھے اور تازہ تازہ بارشیں ہوئی تھیں۔ اُس دن ہم تینوں بھیڑ بکریوں کا ریوڑ اور مویشی لے کر کھیتوں میں پہنچے تو طبیعت پر خود بخود مستی سی چھانے لگی۔ ہر چیز نکھری نکھری ہوئی تھی۔ قریب قریب ہر کھیت کے کونوں کھدروں میں بارش کا پانی موجود تھا۔ تھوڑی دیر تک تو میں اور شفیق کھیتوں میں بھاگتے رہے اس کے

بعد ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ ایسے ہی وقت مجھے بھوک محسوس ہونے لگی۔ میں نے گھر سے لائے ہوئے کھانے کی پوٹلی کھولی اور کھانے میں جت گیا۔ شفیق میرے قریب ہی بیٹھا ہوا تھا۔ مگر میں نے اُسے جھوٹے منہ بھی کھانے کے لیے نہ پوچھا۔ ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک رفیق چلایا۔ ''راجا......شفیق! کلہاڑی میری طرف پھینکو۔''

میں نے رفیق کی طرف دیکھا تو وہ دو بڑے ''بھگیاڑی'' کتوں سے لاٹھی کے ذریعے برسرپیکار تھا۔ کتے بھیڑبکریوں پر حملہ کر رہے تھے۔ جبکہ رفیق اُنھیں لاٹھی سے ہشکار رہا تھا۔ مگر کتے ٹلتے ہوئے نظر نہیں آتے تھے۔ اچانک ایک کتے نے رفیق کو ڈاج دیتے ہوئے ایک بکری پر حملہ کر دیا۔ تب رفیق خوف زدہ ہو کر اتنی زور سے چلایا کہ میں اور شفیق فوراً اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ''جلدی کرو کلہاڑی پھینکو یہ کتے نہیں بھیڑیے ہیں۔''

بھیڑیوں کا سن کر شفیق نے ایک چیخ ماری اور اندھا دھند مشرق کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ میں بھی شفیق کی دیکھا دیکھی اُس کے پیچھے دوڑ پڑا۔ ہم دونوں پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ ایک بار بھی ہم نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ بھاگتے بھاگتے ہم نے کئی کھیت عبور کر لیے تھے۔ پھر جب ہم دونوں کے سانس پھول گئے تو نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں رکنا پڑا۔ رفیق کو ہم کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ وہ اور بکریوں کا ریوڑ ہمیں نظر بھی نہیں آتا تھا۔ شفیق کا رنگ بدستور اُڑا ہوا تھا۔ تاہم میں قدرے مطمئن تھا کہ بھیڑیے اب میری نگاہوں سے اوجھل تھے۔ چند لمحے تو ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

پھر شفیق بولا۔ ''راجا! اب کیا ہوگا؟ اگر بھیڑیے اس طرف آ گئے تو ہمیں کون بچائے گا؟''

میں نے اُسے ڈرانے کی نیت سے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں ہوگا بس بھیڑیے تجھے کھا جائیں گے۔''

''اور تجھے کیا نہیں کھائیں گے؟'' اُس نے سہمے ہوئے انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''وہ جب تجھے کھا رہے ہوں گے تو میں بھاگ جاؤں گا۔''

''مم......میں تجھ سے پہلے......بھاگ جاؤں گا۔'' اُس نے خوف سے لرزیدہ آواز میں جواب دیا۔

''تم بے وقوف ہو۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بھیڑیوں سے تیز بھلا کیسے دوڑو گے؟''

''تت......تت......تم کیا دوڑ سکو گے؟''

”نہیں میں بھی نہیں دوڑ سکوں گا۔“

”پھر تو وہ تجھے بھی کھا جائیں گے۔“ اُس نے پہلی بار قدرے خوش ہو کر جواب دیا۔

”نہیں وہ مجھے نہیں کھا سکتے۔“

وہ ایک دم جوش میں آ گیا۔ ”کیوں نہیں کھا سکتے......تم کیا لوہے کے بنے ہوئے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”وہ جب تمہیں کھا رہے ہوں گے تو میں درخت پر چڑھ جاؤں گا۔ بابا کہتے ہیں کہ بھیڑیے درخت پر نہیں چڑھ سکتے۔“

شفیق چونکہ درختوں پر نہیں چڑھ سکتا تھا۔ سو اُونچے سُروں میں رونے لگا۔

میں نے کہا۔ ”بے وقوف! بھیڑیے تمہارے رونے کی آواز سن کر فوراً پہنچ جائیں گے۔“

وہ روتے روتے ایک دم چپ ہو گیا اور پھر اُٹھ کر ایک طرف چل پڑا۔

میں نے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

”گھر جا رہا ہوں۔“ اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”اور اگر رستے میں بھیڑیے مل گئے تو کیا کرو گے؟“

وہ بوکھلا کر واپس پلٹا اور میرے بازو سے لگ کر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”شفیق! اگر ہم دونوں سکول جانا شروع کر دیں تو ہمیں مویشی چرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تم میرے ساتھ سکول آؤ گے نا؟“

”بھیڑیوں سے بچ گیا تو ضرور آؤں گا۔“

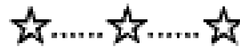
”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”چلو اب رفیق کا پتا کرتے ہیں۔“

”نن......نہیں......مم......میں نہیں آ سکتا......وہاں بھیڑیے ہوں گے۔“ اُس نے خوف زدہ ہو کر جواب دیا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔“ میں اُٹھ کر رفیق کی طرف چل دیا۔

وہ چند لمحے تذبذب کے عالم میں بیٹھا رہا اور پھر دوڑ کر مجھ سے آ ملا۔ ہم وہاں پہنچے تو رفیق بھیڑیوں کو بھگا چکا تھا۔ تاہم ایک بھیڑیے نے رفیق کی ایک بکری کو معمولی سا زخمی کر دیا تھا۔ اُس دن پہلی مرتبہ مجھے رفیق کی

بہادری کا معترف ہونا پڑا تھا۔



دوسرے روز صبح سویرے ناشتا کرنے کے بعد جب میں نے سکول بیگ اُٹھایا تو اماں اور بابا مجھے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر بابا نے خوشی کے عالم میں کہا۔

''بہت خوب راجا! میں تجھے ہمیشہ اسی روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا۔''ابا جی! میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی سکول سے ناغہ نہیں کروں گا۔''

اماں نے آگے بڑھ کر میری پیشانی پہ بوسہ دیا۔''دیکھنا ملک قدیر! ایک دن میرا بیٹا بہت بڑا افسر بنے گا۔ اتنا بڑا کہ سارے گاؤں والے حیران رہ جائیں گے۔''

''ہاں۔'' بابا نے اماں کی تائید کی۔''اتنی بڑی سی گاڑی ہوگی ہمارے راجا بیٹے کے پاس، جس میں یہ دفتر جایا کرے گا۔''

''اچھا اماں! خدا حافظ۔'' میں نے اجازت طلب کی۔

بابا بولے۔''نا بھئی نا! میں تجھے جیپ میں سکول چھوڑ آتا ہوں۔''

''نہیں ابا جی!'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔''گاؤں کے دوسرے بچے بھی تو پیدل سکول جاتے ہیں نا! تو بس میں بھی پیدل سکول جایا کروں گا۔''

''واہ بھئی واہ........ ہمارا راجا تو بہت سیانا ہو گیا ہے۔'' بابا مسکرائے۔

اُس روز جب میں دوبارہ سکول پہنچا تو میرے ساتھ شفیق بھی تھا۔ دراصل ہم دونوں بھیڑیوں کے خوف سے سکول جانے کے لیے تیار ہوئے تھے۔ مگر گھر والوں کو ہم نے یہ بات نہیں بتائی تھی۔ میں لگ بھگ چار پانچ ماہ سکول سے غیر حاضر رہا تھا۔ اس لیے میرا نام کٹ چکا تھا۔ چنانچہ نئے ماسٹر جی نے مجھے دوبارہ پہلی کلاس میں داخل کر دیا جب کہ شفیق کا قد کاٹھ چونکہ مجھ سے بڑا تھا تو ماسٹر جی نے اُسے دوسری جماعت کے بچوں کے ساتھ بٹھا دیا تھا۔ اُس دن پہلی بار مجھے یہ احساس ہوا کہ نئے ماسٹر جی صرف نام کے ماسٹر ہیں۔ ورنہ اُسے آتا واتا کچھ بھی نہیں تھا۔ پہلے والے ماسٹر جی ہمارے ہی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ مگر نئے ماسٹر جی کا تعلق ایک دوسرے

گاؤں سے تھا۔

نئے ماسٹرجی سب بچوں کے لیے اجنبی تھے۔ کیونکہ اُن کا تعلق ہمارے گاؤں سے نہیں تھا۔ وہ بچوں کی پڑھائی پہ کم اور اپنی مونچھوں پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ ڈیوٹی کا بیش تر حصہ وہ اپنی مونچھوں کو سنوارنے میں جب کہ آخری گھنٹہ بچوں کو مارنے میں صَرف کردیتے تھے۔ شفیق نے پہلے دن کی پٹائی سے عبرت حاصل کرتے ہوئے آدھی چھٹی کے بعد ہمیشہ کے لیے سکول کے ساتھ ساتھ نئے ماسٹرجی پر بھی چار حروف بھیجے اور اپنی رنگین دنیا میں واپس لوٹ گیا۔ جب کہ میں ڈٹا رہا اور روزانہ ماسٹرجی سے مار کھاتا رہا۔ یہاں تک کہ مجھے ہندسے لکھنا آ گیا۔ الف انار اور ی یکہ بھی میں نے فر فر یاد کرلیا تھا۔

اُن دنوں میں اکثر یہ دعا بھی کرتا رہتا تھا کہ ”اے اللہ! اس نئے ماسٹرجی کو مونچھوں سمیت اُٹھالے، اس پر آسمانی بجلی گرادے یا پھر اسے لولا لنگڑا بنادے تاکہ یہ سکول تشریف نہ لاسکے۔“ مگر وہ کہتے ہیں نا! کہ بچوں کی دعائیں اگر قبول ہوتیں تو ایک بھی ماسٹر زندہ نہ رہتا۔ سو میری دعائیں بھی شرفِ قبولیت حاصل نہ کرسکیں۔ یہاں تک کہ میں اول ادنیٰ سے اول اعلیٰ اور پھر دوسری جماعت میں پہنچ گیا۔ انہی دنوں بالکل غیر متوقع طور پر ماسٹرجی کا تبادلہ ہوگیا۔ اُن کی جگہ آنے والے نئے ماسٹرجی میرے بابا کے بچپن کے دوست تھے۔ چنانچہ وہ مجھ پر خصوصی توجہ دینے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرا شمار سکول کے ذہین ترین طلباء میں ہونے لگا۔ تیسری جماعت میں پہنچتے ہی مجھے پورے سکول کا کمانڈر منتخب کرلیا گیا۔ اب صبح سویرے اسمبلی کرانا میری ذمہ داری تھی۔ اس کے علاوہ میں اپنی کلاس کا مانیٹر بھی تھا۔ وہ چونکہ پرائمری سکول تھا۔ اس لیے پنجم کے بعد مجھے ہائی سکول میں داخل کرادیا گیا مگر میں نے یہ کلاس مانیٹر اور سکول کمانڈر والا اعزاز میٹرک تک برقرار رکھا۔

میں نے اور یاسمین نے ایک ساتھ ہی میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس کے بعد میں کالج پڑھنے لگا ...... جب کہ یاسمین گھر میں بیٹھ گئی۔ خالو نے اسے شہر جاکر کالج میں پڑھنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میری اور یاسمین کی محبت وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہری ہوتی گئی۔ چونکہ ہم قریبی رشتادار تھے اس لیے ہمارے ملنے ملانے پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی۔ ہم تقریباً روزانہ ہی ملا کرتے تھے۔ ڈھیروں باتیں کرتے اور مستقبل کے سہانے خواب دیکھتے رہتے تھے۔ بظاہر ہمارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ مگر مجھے کبھی کبھی خالو کے رویے

سے ڈر لگتا تھا۔ ویسے تو خالو بہت ہی خاموش طبع شخص تھے۔ اُنھوں نے کبھی میرے آنے پر اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی کبھی یاسمین کو ہمارے گھر آنے سے روکا تھا۔ لیکن میری چھٹی حس ہمیشہ مجھے یہ احساس دلاتی رہتی تھی۔ کہ یاسمین کا اور میرا ملن اتنا آسان نہیں ہے۔ جتنا میں سمجھ رہا ہوں۔

پھر وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا اور میں نے ایم ایس سی کرلیا۔ انہی دنوں پورے ملک میں موبائل فون عام ہوگیا۔ چنانچہ چوری چھپے میں نے یاسمین کو بھی ایک موبائل فون خرید دیا۔ اب ہم دونوں گھنٹوں موبائل فون پر لگے رہتے تھے۔ دنیا جہان کی باتیں کرتے تھے۔ مگر پھر بھی تھکتے نہیں تھے۔ پیار جذبہ ہی ایسا ہے کہ اس میں کوئی بھی نہیں تھکتا۔ یہ وہ قید ہے کہ جس کے اسیر کبھی بھی رہائی کی تمنا نہیں کرتے۔ اماں اور بابا کو ہمارے پیار کے بارے میں سب معلوم تھا۔ خالہ کلثوم بھی ہماری چاہت سے بے خبر نہیں تھیں۔ اگر کوئی شخص لاعلم تھا تو وہ تھے یاسمین کے ابا یعنی خالو اعجاز احمد۔ اُنھیں ہمارے اس بچپن کے پیار کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

اُس روز جب میں اور یاسمین اکیلے میں ملے تو میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''یاسمین! تم اپنے ابا جی سے بات کرو نا! ہم کب تک یوں اپنا پیار چھپا کر رکھیں گے؟''

وہ بولی۔ ''راجا! مجھے ابا جی سے بہت ڈر لگتا ہے......وہ شاید اسے گستاخی سمجھیں گے۔''

''بھئی! یہ گستاخی تو تجھے ایک دن کرنا ہی پڑے گی۔ ورنہ ہم دونوں عمر بھر ترستے ہی رہیں گے۔''

''تم خالو کو رشتے کے لیے کیوں نہیں بھیجتے؟'' اُس نے اُلٹا سوال کردیا۔

میں نے کہا۔ ''میں تو ابا جی کو جب چاہوں بھیج سکتا ہوں۔ لیکن خالو کی مرضی معلوم کرنا بھی تو ضروری ہے۔ وہ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم جائیداد کے لالچ میں رشتا لے کر آئے ہیں۔ اُنھیں پتا تو چلنا چاہیے نا! کہ تمہاری بھی یہی مرضی ہے۔''

''اس طرح تو بات بگڑ جائے گی راجا'' اُس نے خدشہ ظاہر کیا۔

''نہیں بگڑے گی۔ بس تم ذرا ہمت کرلو، آخر تم اُن کی اکلوتی بیٹی ہو تمہاری بات وہ کبھی نہیں ٹالیں گے۔''

''نہیں راجا! مجھ سے یہ نہیں ہوسکے گا۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بے شک میں تجھ سے بے حد پیار کرتی ہوں مگر ابا جی سے بات کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔''

''یاسمین! اگر مجھے پانا چاہتی ہو تو پھر تجھے یہ قدم اُٹھانا پڑے گا۔''

''کیا تم مجھے نہیں پانا چاہتے؟'' اُس نے شاکی انداز میں پوچھا۔

''پانا چاہتا ہوں۔ اسی لیے تو اماں اور بابا سے بات بھی کرلی ہے۔ اب تم کچھ کرو گی تو تب ہی یہ بیل منڈھے چڑھ پائی گی۔''

''میں ضرور کرتی مگر.................'' وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہو گئی اور متوحش انداز میں میرے عقب میں دیکھنے لگی۔

اُس وقت ہم دونوں اُن کی حویلی سے متصل باغ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اُس کی نظروں کے تعاقب میں گھوم کر دیکھا تو خالو کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے پایا۔ وہ یاسمین کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اُن کی نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے یاسمین نے خوف زدہ ہو کر نگاہیں جھکا لیں۔ میں نے سہمے ہوئے انداز میں خالو کی طرف دیکھا اور ڈرتے ڈرتے بولا۔ ''خالو!.........دراصل بات.........''

''خاموش۔'' اُنھوں نے گرج کر قطع کلامی کی۔ ''اپنی ہی خالہ کے گھر میں ڈاکا ڈالتے ہوئے تجھے شرم نہیں آئی۔ جی چاہتا ہے تیرے سینے میں گولی اُتار دوں۔''

''خالو! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔'' میں نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے کون سا ایسا غلط کام کیا ہے کہ آپ اس قدر غصہ کر رہے ہیں؟''

''تم فوراً دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ..........'' اُنھوں نے بات نامکمل چھوڑ دی۔

''ورنہ کیا؟'' نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے غصہ آگیا۔ ''آپ مجھے گولی ماردیں گے نا! تو جایئے رائفل لے آیئے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاگوں گا نہیں۔''

''تم.........تم اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو لڑکے۔'' خالو نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ''میں قدیر بھائی کا لحاظ کر رہا ہوں ورنہ اب تک تم لاش بن چکے ہوتے۔''

''خالو! میں نے یاسمین سے پیار کیا ہے اور پیار کرنے والے موت سے نہیں ڈرتے۔''

''تم......تمہاری......یہ جرأت۔'' خالو کے منہ سے غصے کی شدت سے کف اُڑنے لگا۔ ''میں......میں

تجھے کاٹ کر رکھ دوں گا........بے حیا، بے شرم کہیں کے۔"

"آپ......آپ زیادتی کر رہے ہیں خالو! میں کوئی کمین نہیں ہوں۔ بزرگ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ.............."

"بکواس مت کرو۔" خالو حلق کے بل چلائے اور میری بات ادھوری رہ گئی۔ "جاؤ دفع ہو جاؤ یہاں سے اور آئندہ کبھی بھول کر بھی میرے گھر میں قدم نہ رکھنا۔ ورنہ کتے کی موت مارے جاؤ گے۔ میں نے تم جیسا ذلیل انسان آج تک نہیں دیکھا۔"

اپنی اتنی زیادہ تذلیل ہوتے دیکھ کر میرا بھی پارہ بلند ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "خالو! میں آپ کی طرح اس قدر گھٹیا زبان تو استعمال نہیں کر سکتا۔ تاہم اتنا سن لیجیے کہ یاسمین میری تھی۔ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔ اگر آپ نے کچھ ایسا ویسا کیا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہو گا۔ میں نام و نشان مٹا دوں گا آپ کا۔"

"اس سے پہلے میں تمہارا قصہ کیوں نہ پاک کر دوں؟" خالو نے طیش کے عالم میں جواب دیا اور باغ کے خارجی گیٹ کی طرف بڑھ گئے۔

"تمہیں خدا کا واسطہ بھاگ جاؤ راجا۔" باپ کے جاتے ہی یاسمین نے التجا کی۔ "ابا جی تجھے مار ڈالیں گے۔ وہ.....وہ شاید رائفل لینے گئے ہیں۔"

"نہیں۔" میں نے انکار میں سر ہلایا۔ "بھاگتے بزدل ہیں اور میں بزدل نہیں ہوں۔ میں اُن کا سامنا کر کے رہوں گا۔"

"تجھے میرے پیار کا واسطہ انکار مت کرو۔" اُس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "بات مزید بگڑ جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "بات تو کب کی بگڑ گئی ہے۔ اب مزید کیا بگڑے گی؟"

"تم اگر ایک منٹ میں یہاں سے نہ گئے تو میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آج ہی زہر پھانک لوں گی۔" اُس نے کچھ اس انداز میں کہا کہ میں تڑپ اُٹھا۔ اُس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے۔ اُس پر عمل کرنے سے گریز نہیں کرے گی۔

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے یاسمین! میں جا رہا ہوں لیکن قسم کھا کر وعدہ کرو کہ تم کوئی بھی غلط قدم نہیں اُٹھاؤ گی؟"

''مجھے کچھ بھی نہیں ہوگا۔تم جاؤ، جلدی کرو۔'' باپ کو دُور سے آتے دیکھ کر وہ چلائی۔

میں نے ایک نظر پریشان حال یاسمین پر ڈالی اور پھر مخالف سمت میں باغ کی باؤنڈری وال کی طرف دوڑ لگادی۔باؤنڈری وال کے ساتھ آم اور دوسرے پھل دار درخت ایک ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔یہ پختہ دیوار لگ بھگ دس فٹ بلند تھی۔اُسے بغیر کسی سہارے کے عبور کرنا ممکن نہیں تھا۔بغیر وقت ضائع کیے میں نے آم کا ایک قدرے اُونچا درخت منتخب کیا۔جست لگا کر درخت پر چڑھا۔وہاں سے دیوار پہ ہاتھ ڈالا اور پل کی پل میں دیوار کے اُوپر پہنچ گیا۔ایسے ہی وقت مجھے پہلے یاسمین کی چیخ اور پھر فائر کی آواز سنائی دی۔مگر گولی شاید میرے اُوپر سے گزر گئی تھی۔دوسرے ہی لمحے میں دیوار کی دوسری جانب کود گیا۔

☆......☆......☆

اُسی دن رات کے وقت خالو ہمارے گھر پہنچ گئے۔بابا اُسے یوں اچانک دیکھ کر پہلے تو حیران رہ گئے پھر مسکرا کر پوچھا۔''اعجاز بھائی! خیر تو ہے۔رات کے اس وقت کیسے تکلیف کی؟''

وہ بولے۔''راجا نے آپ کو کچھ نہیں بتایا۔اُس نے آج عصر کے وقت جو ''چن'' چڑھایا ہے۔آپ اُس کے متعلق کچھ نہیں جانتے یا پھر مجھے بے وقوف سمجھتے ہیں؟''

''اعجاز بھائی! آپ بیٹھیں تو سہی ایسا کیا کر دیا ہے راجا نے؟ میں ابھی اُس سے پوچھتا ہوں۔'' بابا نے بدستور مسکرا کر جواب دیا۔

''میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا۔'' وہ چلائے اور میرا دل پہلو میں اچھلنے لگا۔''بلکہ آپ کو متنبہ کرنے آیا ہوں۔آج کے بعد اگر راجا نے میرے گھر میں قدم بھی رکھا تو میں اُسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔آج تو وہ میرے ہاتھ سے بچ کر بھاگ نکلا مگر ہر بار بھاگنے کا موقع نہیں ملتا۔اُسے اپنی زبان میں سمجھا دیں کہ وہ آگ کے ساتھ مت کھیلے۔ورنہ نتیجہ بہت ہی بُرا نکلے گا۔''

''اعجاز بھائی! آپ کچھ بتائیں گے تو مجھے معلوم ہوگا نا! کہ راجا نے......................''

''اُس نے بہت ہی گھٹیا حرکت کی ہے۔'' خالو نے غصے کے عالم میں قطع کلامی کی۔''ایسا تو کبھی کسی کمی کمین نے بھی نہیں کیا ہوگا۔جیسا آپ کے سپوت راجا نے کیا ہے۔مجھے اگر آپ کا لحاظ نہ ہوتا تو آج اُس نے جان

سے ہاتھ دھو لیے تھے۔“

”آپ مہربانی فرما کر تشریف تو رکھیں۔“ بابا نے بدستور التجا کی۔”میں آپ کی ہر شکایت دور کر دوں گا۔“

”میں لعنت بھیجتا ہوں اس حویلی اور اس کے مکینوں پر، آپ راجا.............“

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟“ معاً چاچا نذیر نے پہنچ کر مداخلت کی تو خالو کی بات ادھوری رہ گئی۔”تم سمجھتے کیا ہو خود کو؟ بھائی جان اگر خاموش ہیں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ تم سے ڈرتے ہیں؟ اور راجا کو تم ہاتھ لگا کر تو دکھاؤ ایسی مرمت کروں گا کہ عقل ٹھکانے آجائے گی۔ جاؤ اب دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ چار کاندھوں پہ سوار ہو کر جانا پڑے گا۔“

”نذیر! تم خاموش رہو۔“ بابا چلائے۔”یہ ہمارا گھریلو معاملہ ہے۔ اسے ہم خود حل کر لیں گے۔“

”میں بھی اسی گھر کا ہوں بھائی جان! اور میرے سامنے کوئی آپ کی تذلیل کرے یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ چاچا نذیر نے جواب دیا۔

”دیکھ لیا ملک قدیر!“ خالو طنزیہ انداز میں بولے۔”یہ ہے اس حویلی کے مکینوں کی اوقات۔ یہ گھر آئے.............“

”فوراً نکلو فوراً۔“ چاچا نذیر نے چٹکی بجاتے ہوئے قطع کلامی کی۔”میرا میٹر گھوم گیا تو تم کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہو گے۔“

اب میری مداخلت ناگزیر ہو گئی تھی۔ چنانچہ میں اپنے بستر سے اُٹھ کر خالو کے عین سامنے پہنچ گیا اور پوری خود اعتمادی کے ساتھ کہا۔”خالو! میں وہاں سے بھاگا نہیں تھا۔ بلکہ مجھے یاسمین نے واسطے دے کر وہاں سے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے مجھے زہر پھانک لینے کی بھی دھمکی دی تھی۔ ورنہ میں آپ کی زنگ خوردہ رائفل سے ڈر کر بھاگنے والا نہیں تھا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ نے کبھی چڑیا تک نہیں ماری۔ اور اب آپ کے لیے بہتر یہی ہو گا کہ یہاں سے چپ چاپ نکل لیں ورنہ چاچا نذیر نے جو کچھ کہا ہے۔ اُس پر عمل کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔“

”راجا!“ بابا گرجے۔”یہ کیا بدتمیزی ہے۔ کوئی اپنے خالو سے بھی بھلا اس لہجے میں بات کرتا ہے۔ تم میں

کچھ شرم وحیا ہے کہ نہیں؟''

''اباجی! میں نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ میں اماں اور آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں یاسمین کو پسند کرتا ہوں اور اُسے اپنی شریکِ حیات بنانا.......''

''خاموش ہو جاؤ بے غیرت انسان!'' خالو نے چلا کر قطع کلامی کی۔ ''کیا ملک قدیر کے گھر سے غیرت رخصت ہو گئی ہے؟ باپ کے سامنے اُس کی بیٹی کا نام لیتے ہوئے تجھے ذرا بھی شرم نہیں آتی؟''

''بس ملک اعجاز!'' بابا نے بدلے ہوئے لہجے میں ہاتھ اُٹھا کر خالو کو وارننگ دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ کی بہت عزت کر لی ہے۔ اب بھلائی اسی میں ہے کہ فوراً یہاں سے چلتے بنو ورنہ آپ کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔''

''میں جانتا تھا کہ آپ اپنے بیٹے کا ہی ساتھ دیں گے۔ اس لیے آج کے بعد میرے گھر کے دروازے آپ لوگوں کے لیے ہمیشہ کے لیے بند۔ نہ تو ہم لوگ یہاں قدم رکھیں گے اور نہ ہی آپ لوگ میرے دروازے پر آئیں گے۔''

چاچا نذیر نے کہا۔ ''ہمیں کیا ضرورت ہے تم جیسے گھٹیا انسان سے تعلق رکھنے کی؟''

''تم لوگوں سے اور اُمید ہی کیا رکھی جا سکتی ہے؟'' خالو نے بھی چاچا نذیر کی دیکھا دیکھی آپ جناب کا صیغہ ترک کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر پاؤں پٹختے ہوئے حویلی کے صدر دروازے کی طرف چل دیا۔

تب تک وہاں حویلی کے سب مرد عورتیں اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ بابا اور اماں سے معاملے کی نوعیت جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر چاچا نذیر نے سب کو جھڑک کر واپس بھیج دیا۔ اب وہاں چاچا نذیر، بابا، اماں اور میں رہ گئے تھے۔ بابا نے چاچا نذیر سے کہا۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا نذیر! اعجاز بھائی کے ساتھ ہمیں یہ سلوک نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

وہ بولے۔ ''بھائی جان! ہم نے کچھ غلط نہیں کیا۔ وہ ہمارے ہی گھر میں ہمیں ذلیل کر رہا تھا۔ ہم اگر خاموش رہتے تو وہ اور شیر ہو جاتا۔''

''پھر بھی گھر آئے انسان کے ساتھ کوئی ایسا سلوک تو نہیں کرتا نا! جیسا ہم نے اُس کے ساتھ کیا ہے؟''

”تو کیا ہم اپنی بے عزتی برداشت کرتے رہتے؟“ چاچا نذیر نے سوال کیا۔

”میں نے یہ کب کہا ہے؟ بہر کیف ہمیں برداشت کا مظاہرہ کرنا چاہیے تھا۔ غلطی راجا نے کی ہے تو......“

”ابا جی! میں نے کوئی غلطی نہیں کی۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔”اس سے قبل بھی میں خالہ کے گھر جاتا رہتا ہوں اور یاسمین سے گفت گو بھی ہوتی رہتی ہے۔ ایسا کوئی پہلی بار تو نہیں ہو رہا۔ مجھے لگتا ہے خالو کو کسی نے بھڑکایا ہے۔“

”مگر مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ چھپا رہے ہو؟“ بابا مشکوک انداز میں بولے۔”کہیں تم نے یاسمین کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کی، جس سے.............“

”ملک جی! خدا کا خوف کرو۔“ اماں نے مداخلت کی۔”ہمارا راجا کوئی غلط حرکت نہیں کرسکتا۔ یاسمین اس کی خالہ زاد ہے۔ اعجاز بھائی تو بس لڑنے کا بہانہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس نے یاسمین اور راجا کو باتیں کرتے دیکھا ہوگا اور پھر اسی کو جواز بنا کر وہ ہمارے ہاں دوڑا چلا آیا۔“

”ہاں اماں! بالکل ایسی ہی بات ہے۔ میں اور یاسمین اُن کے باغ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ہی وہاں خالو پہنچ گئے۔ اُنھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ آتے ہی مجھے دھمکیاں دینے لگے۔ اُنھوں نے مجھے گالیاں بھی دیں اور.......اور.......“ میں کہتے کہتے چپ ہوگیا۔

”اور کیا؟“ چاچا نذیر نے جھٹ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔”جب میں اُن کے باغ کی دیوار پھاند رہا تھا تو خالو نے مجھ پر فائر بھی کیا تھا۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں بچ گیا۔ ورنہ آج آپ لوگ مجھے رو رہے ہوتے۔“

یہ سن کر اماں نے خالو اعجاز کی عدم موجودگی میں اُسے صلواتیں سنانا شروع کردیں۔ جب کہ بابا بولے۔”یہ بات تم نے خالو کی موجودگی میں کیوں نہیں بتائی؟“

میں نے کہا۔”میں معاملے کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔“

چاچا نذیر بولے۔”معاملہ تو اب بڑھ چکا ہے۔ اعجاز کو یہ جرأت مہنگی پڑنے والی ہے۔ وہ خود کو سمجھتا کیا ہے؟ میں اُسے چھوڑوں گا نہیں۔“

بابا نے کہا۔ ’’نذیر! تم کوئی بھی غلط حرکت نہیں کرو گے۔ یہ میرا حکم ہے۔‘‘

’’بھائی جان! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن راجا کوئی لاوارث نہیں ہے۔ اعجاز نے راجا پر فائر کر کے اچھا نہیں کیا۔‘‘

’’نہیں۔‘‘ بابا نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’اس کا فیصلہ پنچایت کرے گی۔ ہم کل ہی پنچایت بلائیں گے۔‘‘

’’بھائی جان! پنچایت کم زور لوگ بلاتے ہیں۔ اعجاز کی اوقات ہی کیا ہے ہمارے سامنے؟‘‘

’’بات اوقات کی نہیں ہے۔ رسم و رواج کی ہے۔ پنچایت میں اگر وہ جھوٹا ثابت ہو گیا تو پھر ہم خود ہی اُس سے نمٹ لیں گے۔‘‘

اماں نے کہا۔ ’’ملک جی! پنچایت بلانے سے تو یاسمین بدنام ہو جائے گی۔ جب کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ ہماری ہونے والی بہو ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ اس معاملے پر مٹی ڈالیں۔ میں خود کوئی مناسب موقع دیکھ کر کلثوم سے بات کر لوں گی۔ وہ اعجاز بھائی کو سمجھا دے گی۔‘‘

’’نہیں بھابی! آپ کی بہو کی بدنامی سے ہمیں راجا کی زندگی زیادہ عزیز ہے۔ اعجاز ٹھہرا ایک بزدل انسان جو کبھی بھی اوچھا وار کر سکتا ہے۔‘‘

’’نذیر!‘‘ بابا نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ’’میرے خیال میں راجا کی ماں ٹھیک کہتی ہے۔ ہمیں خوب سوچ سمجھ کر ہی کوئی قدم اُٹھانا ہو گا۔ ویسے بھی عجلت کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔‘‘

’’جیسے آپ مناسب سمجھیں بھائی جان! میں تو آپ کے حکم کا غلام ہوں۔‘‘

’’ٹھیک ہے تو جاؤ آرام کرو۔‘‘ بابا نے بستر پر لیٹتے ہوئے جواب دیا۔

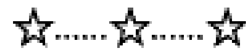
چند روز اسی کش مکش کے عالم میں گزر گئے۔ بابا نے پنچایت بلائی اور نہ ہی یاسمین سے میری بات ہو سکی۔ حالانکہ کہ سیل فون پر میں نے متعدد بار اُس کا نمبر ٹرائی کیا۔ مگر ہر بار اُس کا نمبر بند ہی ملا۔ میری پریشانی روز بروز بڑھنے لگی۔ پانچویں روز صبح دس بجے کے لگ بھگ اماں خالہ کلثوم کے گھر جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ جب وہ جانے لگیں تو میں نے کہا۔

’’اماں! میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ کم سے کم یاسمین کو تو دیکھ لوں گا۔‘‘

''نہیں پتر!'' اماں نے انکار میں سر ہلایا۔''تمہیں دیکھ کر اعجاز بھائی پھر بپھر جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے اماں! مگر خالہ سے رشتے کی بات ضرور کرنا۔ میں یاسمین کے علاوہ کسی سے بھی شادی نہیں کروں گا۔''

''کروں گی تم فکر نہ کرو اللہ بہتر کرے گا۔'' اماں جواب دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ جب کہ میں یاسمین کے سنگ گزرے دنوں کی یادوں میں کھو گیا۔



وہ ساون کے دن تھے۔ سکول چونکہ گرما کی چھٹیوں کی وجہ سے بند تھے۔ اس لیے میں اور یاسمین سارا سارا دن اُن کے باغ میں کھیلتے رہتے تھے۔ اُس وقت میری عمر لگ بھگ بارہ برس تھی۔ یاسمین بھی تقریباً اتنی ہی عمر کی تھی۔ باغ میں آم پکے ہوئے تھے۔ چنانچہ میں اور یاسمین ایک سنگی بنچ پر بیٹھے آم چوس رہے تھے۔ وقت یہی کوئی دس گیارہ بجے کا ہوگا۔ آم بہت زیادہ لذیذ تھے اور ہم ندیدوں کی طرح چوس رہے تھے۔ سنگی بنچ کے عین درمیان میں ہم نے آموں سے بھری ٹرے رکھی ہوئی تھی۔ جس میں تقریباً دس بارہ موٹے موٹے آم رکھے ہوئے تھے۔ آم چوستے ہوئے بالکل غیر متوقع طور پر یاسمین بولی۔ ''چلو راجا! آج ایک شرط لگاتے ہیں۔'' اُس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''کیسی شرط؟'' میں نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ بولی۔ ''یہی کہ جس نے زیادہ آم کھائے وہ دوسرے کو دو عدد زوردار تھپڑ لگائے گا۔ بولو منظور ہے؟''

''مجھے منظور ہے لیکن تم رو پڑو گی۔''

''وہ کیوں بھلا؟'' اُس نے بڑی بڑی آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''تم شرط ہار جاؤ گی اور میرا ہاتھ بہت وزنی ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ بھول ہے تمہاری۔ اماں کہتی ہے میں بہت بڑی پیٹو ہوں۔ شرط میں نہیں تم ہار جاؤ گے۔''

''تو چلو پھر مقابلہ شروع کرتے ہیں۔'' میں نے آم دو برابر حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھ لو پانچ آم تمہارے اور پانچ میرے۔''

”ٹھیک ہے۔“ اُس نے آم اُٹھا کر کھانا شروع کر دیا۔

میں نے بھی ایک آم اُٹھایا اور اُسے ہاتھوں میں دبا کر پلپلا کرنے لگا۔ جب آم خوب پلپلا ہو گیا تو میں اُسے چُوسنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے میں نے تیسرا آم اُٹھا لیا۔ جب کہ وہ ابھی دوسرے کے ساتھ نبرد آزما تھی۔ جب اُس نے تیسرا آم اُٹھایا تو اچانک میں نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی شوخی رخصت ہو چکی تھی اور چہرے پر شکست سے پہلے ہی شکست خوردگی کے آثار تھے۔ اُس کی اُتری ہوئی صورت دیکھ کر میرا سارا جوش وخروش صابن کے جھاگ کے مانند بیٹھ گیا۔ دوسرے ہی لمحے میرے سینے میں چھن کی آواز سے جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ میں تیسرا آم کھانے کے بعد چوتھے کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گیا۔ ایسے ہی وقت دماغ نے کہا۔ ”یہ کیا بے وقوفی ہے؟ آم اُٹھاؤ تم یہ مقابلہ جیتنے والے ہو۔“

دل بولا۔ ”دماغ کی مت سنو، میں یاسمین کی ہار برداشت نہیں کر سکوں گا۔ جس طرح بھی ممکن ہو تم یہ مقابلہ ہار جاؤ۔“

دماغ نے کہا۔ ”جان بوجھ کر ہارنے والے بے وقوف ہوتے ہیں۔ کیا تم بے وقوف ہو؟“

دل بولا۔ ”کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ جن سے ہار کر اچھا لگتا ہے۔ تم ہار کر تو دیکھو، جیت سے زیادہ خوشی ملی گی۔“

دماغ نے طنزاً کہا۔ ”دل بے چارا تو بہت کم زور ہوتا ہے۔ ہنستے ہنستے بھی رو دیتا ہے۔ تم اس کی مت سنو یہ تمہیں رسوا کرنا چاہتا ہے۔“

دل بولا۔ ”ایسی رسوائی تو مقدر والوں کو ملتی ہے۔ دماغ تم سے یہ خوشی چھیننا چاہتا ہے۔“

دماغ نے کہا۔ ”دل بے وقوف ہے۔ اس کی باتوں میں مت آؤ۔“

دل بولا۔ ”بے شک میں بے وقوف ہوں مگر مکار نہیں ہوں۔“

دماغ نے بپھر کر کہا۔ ”تم اس معاملے میں ٹانگ مت اڑاؤ، تمہارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“

دل ہنس کر بولا۔ ”جا رے مکار! یہاں تو معاملہ ہی دل کا ہے۔ میں نہیں بولوں گا تو اور کون بولے گا؟“

دماغ لاجواب ہو کر رہ گیا۔ آم کی طرف بڑھتا میرا ہاتھ رک گیا۔ تب میں نے مصنوعی ابکائیاں لینا شروع کر دیں۔ میں یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے مجھے قے آنے لگی ہو۔ میں نے یاسمین کی طرف دیکھا تو مجھے اُس کا چہرہ

کھلا کھلا سا نظر آنے لگا۔ جیت کی خوشی میں وہ گلنار ہوئی جا رہی تھی۔ اُس نے جلدی جلدی تیسرا آم چوسا اور پھر چوتھا اُٹھا لیا۔

''اب بولو راجا۔'' وہ خوشی سے چہکی۔ ''میں نے کہا نہیں تھا کہ میں بہت بڑی پیٹو ہوں؟ اب مقابلہ کرو نا!''

''اوغ۔'' میں نے ایک زوردار مصنوعی ابکائی لی۔ ''میں.........میں اپنی ہار تسلیم کرتا ہوں۔''

''یوں نہیں تھپڑ بھی کھانا پڑیں گے شرط کے مطابق۔'' وہ مسکرائی۔

تبھی میرے دل نے کہا۔ ''بتاؤ یہ ہار کیسی لگی؟''

میں مسکرا دیا تو دل خوشی سے جھوم اُٹھا۔ یاسمین نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر پوچھا۔ ''راجا! ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''آج میں بہت خوش ہوں۔''

''تم جان بوجھ کر ہارے ہو ناں؟'' اُس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے بوکھلا کر کہا۔ ''نہیں......میں سچی مچی ہارا ہوں۔ مجھے قے آ رہی تھی۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو؟'' وہ ایک دم بگڑ گئی۔ ''مجھے بچی سمجھ کر بہلا رہے ہو۔''

''چل پیٹو کہیں کی! بچیاں بھی کبھی چار چار آم کھا سکتی ہیں؟'' میں نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

''سچ بتاؤ ورنہ میں تم سے نہیں بولوں گی۔'' وہ رخ پھیر کر بیٹھ گئی۔

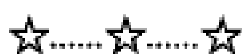
میں نے اُس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یاسمین! میری آنکھوں میں دیکھو، تجھے تیرے سوال کا جواب مل جائے گا۔''

وہ بولی۔ ''راجا! تم نے بہت غلط کیا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم سے جیت کر مجھے خوشی ہو گی؟''

''نن......نہیں......مم........میں نے ایسا تو نہیں سوچا تھا۔'' میری زبان لڑکھڑانے لگی۔

''تو پھر تم جان بوجھ کر کیوں ہارے؟ بولو جواب دو؟'' اُس نے چلا کر پوچھا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس واقعے کے بعد وہ مجھ سے کئی دن خفا رہی تھی۔ اُسے منانے کے لیے مجھے نجانے کتنے ہی جتن کرنے پڑے تھے۔



اماں جب واپس لوٹیں تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ بابا نے پوچھا۔"رقیہ! کیا بات ہے۔یہ تمہارے چہرے پہ بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

اماں نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر نڈھال ہو کر چارپائی پر بیٹھ گئیں۔"ملک صاحب! بہت بُرا ہوا ہے۔"وہ اوڑھنی سے چہرے پہ آیا پسینہ صاف کرتے ہوئے بولیں۔"میں اعجاز بھائی اور کلثوم کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔اُنھوں نے اچھا نہیں کیا۔"

بابا ہنسے۔"مجھے لگتا ہے تمہاری کافی عزت افزائی ہوئی ہے؟"

"یہ بات نہیں ہے۔"اماں نے انکار میں سر ہلایا۔"وہ بے شک مجھے بے عزت کر کے گھر سے نکال دیتے مگر ایسا کام نہ کرتے۔"

میرا دل کسی انجانے خدشے سے بے اختیار دھڑک اُٹھا۔میں نے کہا۔"اماں! ہوا کیا ہے۔آپ کچھ بتاتی کیوں نہیں؟"

"بتانے کو کچھ نہیں بچا راجا۔"اماں نے روہانسی ہو کر جواب دیا اور پھر اُس کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

بابا نے کہا۔"رقیہ! ہمارے صبر کا امتحان مت لو۔جو بھی ہوا ہے بتا دو؟"

"وہ........وہ........اعجاز بھائی نے........یاسمین کی منگنی طے کر دی ہے۔"اماں نے بمشکل بتایا۔

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔"میں نے چلا کر کہا۔"میں خالو اعجاز اور یاسمین کے منگیتر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

بابا بولے۔"راجا! جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ابھی صرف منگنی ہوئی ہے۔کوئی نکاح تو نہیں ہوا؟"

اماں نے کہا۔"چند روز کے اندر ہی اُس کی شادی ہونے والی ہے۔"

"کیا اس فیصلے میں یاسمین کی مرضی شامل ہے؟"بابا نے پوچھا۔

"ہاں۔"اماں نے اثبات میں سر ہلایا۔"وہ تو بہت خوش تھی۔مجھ سے کہہ رہی تھی کہ خالہ میں بہت خوش ہوں۔جلد ہی بیاہ کر پھوپھو کے ہاں شہر چلی جاؤں گی۔اس گاؤں میں رکھا ہی کیا ہے؟"

میں نے کہا۔"میں جانتا ہوں وہ جھوٹ بولتی ہے۔بلکہ اُسے یہ جھوٹ بولنے پر اعجاز خالو نے مجبور کیا ہوگا۔میں خود یاسمین سے بات کروں گا۔"

”پاگلوں جیسی باتیں مت کرو راجا!“ بابا بولے۔”تمہاری ماں کیا جھوٹ بول رہی ہے؟ یاسمین جب اس رشتے پر خوش ہے تو پھر تمہیں کیا تکلیف ہے؟ وہ اگر سچ مچ تم سے پیار کرتی تو پھر رشتے کے لیے ہاں ہی کیوں کرتی؟ اُسے بھول جاؤ، یہ میرا حکم ہے۔“

میں نے کہا۔”آپ کا حکم سر آنکھوں پر ابا جی! مگر میں صرف ایک بار یاسمین سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک بار۔“

”یہ اب ممکن نہیں ہے بیٹے! بس اُسے بھولنے کی کوشش کرو۔“ بابا نے جواب دیا اور پھر تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئے۔

بابا کے باہر نکلتے ہی میں نے فرش پر بیٹھ کر اماں کے گھٹنے پکڑ لیے۔”اماں! اگر آپ چاہیں تو یاسمین سے میری ملاقات ہو سکتی ہے۔“

اماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کسی پتھر کی مورتی کے مانند بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا۔” اماں! آپ بولتی کیوں نہیں۔ خالہ کلثوم سے بات تو کریں مجھے یقین ہے کہ وہ میری اور یاسمین کی آخری ملاقات کے درمیان رکاوٹ نہیں بنیں گی۔“

اماں کی طرف سے اس بار بھی کوئی جواب نہ آیا۔ معاً میری گردن پر گرم پانی کی دو بوندیں گریں۔ میں نے اماں کے گھٹنوں سے سر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھا تو اُنھیں خاموش آنسوؤں سے روتے ہوئے پایا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا دل اپنی مٹھی میں لے کر بھینچ دیا ہو۔

”اماں!“ میں تڑپ اُٹھا۔”آپ روئیں نہ....... آپ کے قدموں میں تو میری جنت ہے۔ میں اپنا مطالبہ واپس لیتا ہوں۔“

اماں کے ہاتھوں میں جنبش ہوئی اور پھر اُن کی اُنگلیاں میرے سر کے بالوں میں رینگنے لگیں۔ انتہائی غم کی کیفیت میں اس وقتی سہارے نے میرے دل کا بوجھ قدرے کم کر دیا تھا۔

”راجا!“ اماں کی بھرائی ہوئی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔”بیٹے! میں کوشش کروں گی۔ آگے اُس کی مرضی جو سب کا مالک ہے۔ اُس کی مرضی ہوئی تو تیری یہ آخری خواہش ضرور پوری ہوگی۔ ورنہ صبر کر لینا کہ یہ

بڑے اجر کا کام ہے۔"

تیسرے دن صبح نو بجے کے لگ بھگ اماں کی کوششوں سے میری اور یاسمین کی خفیہ ملاقات کا انتظام ہو گیا اس شرط کے ساتھ کہ یاسمین میرے سامنے نہیں آئے گی۔وہ کمرے کے دروازے کے عقب میں کھڑے ہو کر صرف دس منٹ کے لیے مجھ سے بات کرے گی۔گو کہ یہ ادھوری ملاقات تھی۔مگر مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق میں نے منظور کر لی۔مقررہ وقت پر میں اُس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا۔جس کے عقب میں یاسمین موجود تھی۔میری حالت اُس وقت کسی سزائے موت پانے والے قیدی کی طرح تھی۔یاسمین دروازے کے پیچھے تھی۔جب کہ میں دروازے کے سامنے۔اُس وقت مجھے شدت کے ساتھ ایک ضرب المثل یاد آئی جس کا مفہوم میں مرتے دم تک نہیں بھول سکوں گا۔"آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔"سکول کے زمانے میں یہ کہاوت میرے پلے ہی نہیں پڑتی تھی۔مگر آج جب میں خود ایسی صورت حال سے دوچار تھا تو یہ کہاوت اپنی پوری سچائی اور سنگینی کے ساتھ مجھ پر واضح ہو رہی تھی۔میں نے سوچا شاید اس کہاوت کا خالق بھی کسی ایسے ہی کڑے وقت سے گزرا ہو گا، جس سے میں گزر رہا ہوں۔پڑھنے والے کب جانتے ہیں کہ لکھنے والے کس کس کرب کی سولی پر جھولتے رہتے ہیں؟ایسے ہی وقت دُور سے ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی عابدہ پروین کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

اُس کے دل پر بھی کڑی عشق میں گزری ہو گی

نام جس نے بھی محبت کا سزا رکھا ہے۔

نجانے کون دل جلا تھا۔جو حکیم ناصر کی غزل پہ دل کے پھپھولے پھوڑ رہا تھا۔مجھے یوں لگا جیسے میری قوتِ گویائی سلب ہو کر رہ گئی ہو۔قدرت مجھ سے پتا نہیں کون سا کھیل کھیلنا چاہ رہی تھی؟یاسمین جو چند روز قبل تک پہروں مجھ سے لگ کر بیٹھی رہتی تھی۔وہی یاسمین آج مجھ سے بہت دُور تھی۔اتنی دُور کہ میں چاہتے ہوئے وہ فاصلہ طے نہیں کر سکتا تھا۔جو کاتبِ تقدیر نے ہماری قسمت میں لکھ دیا تھا۔

"شہیر حسن!"معاً میری سماعتوں سے یاسمین کی بے تاثر آواز ٹکرائی۔"آپ کو جو بھی سوال کرنا ہے۔جلدی سے کریں۔میرے پاس وقت نہیں ہے۔"

یہ لفظ نہیں تھے۔زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔اُس کے لہجے میں شناسائی کی ہلکی سی رمق بھی نہیں تھی۔ایسا تو

میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔میری خوش فہمیوں کا فلک بوس محل ایک پل میں دھڑام سے گرا اور کانچ کے گلاس کی طرح کرچی کرچی ہو گیا۔

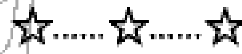
''یاسمین!''شدتِ غم سے میری آواز لرز رہی تھی۔''کیا.......کیا تم.......اپنی مرضی سے......شادی......''

''ہاں شہیر حسن!یہی سچ ہے۔''اُس نے بے رحمی سے میری بات کاٹ دی۔''میں اپنی مرضی اور خوشی سے یہ شادی کر رہی ہوں۔مجھ پر کسی قسم کا جبر نہیں ہے۔''

اب بولنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔میری آنکھوں سے کچھ ٹپکنے لگا تھا۔شاید یہ آنسو تھے یا پھر دل سے رسنے والا لہو تھا۔دس منٹ ختم ہو چکے تھے۔دروازے کے عقب میں اب مکمل خاموشی تھی۔میں کسی لٹے پٹے مسافر کی طرح بے یار و مددگار ایک لق و دق صحرا میں کھڑا ہوا تھا۔دل شدت غم سے پھٹنے والا تھا کہ ایسے ہی وقت دو شفیق ہاتھوں نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔یہ اماں تھیں۔

''چلو راجا!''اماں بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔''اُس رستے پہ چلنے کا کیا فائدہ جس کی کوئی منزل ہی نہ ہو؟''

اماں مجھے جیسے تیسے کر کے گھر لے ہی آئیں۔مگر کچھ ہی دیر کے بعد میں ایک مضبوط سی رسی لے کر دوبارہ گھر سے نکل گیا۔میرا رخ گاؤں سے باہر گزرنے والی نہر کی طرف تھا۔نہر کے کنارے واقع پیپل کا وہ بوڑھا درخت ہی اب مجھے اس غم سے نجات دلا سکتا تھا۔



پھر وہی ہوا جو ہمیشہ پیار کرنے والوں کے ساتھ ہوتا آیا ہے۔میں انگاروں پہ لوٹتا رہا جب کہ یاسمین ہمیشہ کے گاؤں چھوڑ کر چلی گئی۔اُسے میری آہیں روک سکیں نہ آنسو۔کہتے ہیں کہ وقت بڑے سے بڑا گھاؤ بھی بھر دیتا ہے۔میرے زخم بھی رفتہ رفتہ بھرنے لگے تھے۔تین ماہ گزرنے کے بعد میں زندگی کی رنگینیوں کی طرف دوبارہ لوٹ آیا۔گو کہ یاسمین مجھے اب بھی یاد آتی تھی۔مگر اُس کی یاد میں اب وہ شدت نہیں رہی تھی۔اماں اور بابا مجھے دیکھ کر اب خوش رہنے لگے تھے۔ایک دن صبح کے وقت جب ہم ناشتا کر رہے تھے تو یوں ہی باتوں باتوں میں اماں نے میری شادی کرنے کا ذکر چھیڑ دیا۔وہ بابا سے بولیں۔''ملک صاحب!میں تو چاہتی کہ اب راجا کی شادی کر دی جائے۔یہ کب تک یونہی کنوارا پھرتا رہے گا؟''

بابا کے بولنے سے قبل ہی میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔"اماں! اگر آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہیں تو پھر دوبارہ کبھی میری شادی کا ذکر مت کرنا۔ مجھے نفرت ہوگئی ہے عورت ذات سے۔"

بابا بولے۔"بیٹے! دنیا کی کوئی بھی عورت بے وفا نہیں ہوتی۔ یاسمین بھی بے وفا نہیں تھی۔ بس اُس بے چاری کی قسمت ہی خراب تھی۔"

میں نے کہا۔"ابا جی! مجھے بھی یاسمین سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ لیکن میں شادی نہیں کروں گا۔"

"تو پھر اس طرح زندگی کیسے گزارو گے؟" اماں نے پوچھا۔

"خود کو مصروف رکھ کر زندگی گزاروں گا۔"

بابا بولے۔"بیٹے! میں مانتا ہوں کہ تم بہت اچھے مصور ہو، بہت خوب صورت تصویریں بناتے ہو لیکن کیا ساری زندگی اپنے اس سٹوڈیو میں گزارو گے، جہاں رنگوں اور بُرش کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

"ہاں ابا جی! مجھے اپنے سٹوڈیو میں بہت چین ملتا ہے۔ میں سارا دن پرندوں، جانوروں، پہاڑوں ،دریاؤں اور انسانوں کی تصویریں بنا کر خوش رہتا ہوں۔ کیا آپ لوگ مجھے خوش دیکھنا نہیں چاہتے؟"

"ایسی بات نہیں ہے بیٹے!" بابا نے کہا۔"ورنہ میں تمہیں ایسا شاندار سٹوڈیو بنا کر کیوں دیتا؟"

"تو پھر مجھے میرے سٹوڈیو میں خوش رہنے دیجیے ابا جی۔"

"ٹھیک ہے بیٹے! ہم تو تمہاری خوشی میں خوش ہیں۔ جو دل چاہے کرو۔" بابا نے جواب دیا اور میں اُٹھ کر سٹوڈیو کی طرف چل دیا۔

سٹوڈیو حویلی کے اندر ہی واقع تھا۔ تاہم اُس کا ایک دروازہ گلی کی جانب بھی کھلتا تھا۔ کالج لائف میں مجھے جنون کی حد تک مصوری کا شوق رہا تھا۔ اب یہی شوق میرے لیے وقت گزاری کا بہانہ بن گیا تھا۔ میں نے سٹوڈیو کے اندر قدم رکھتے ہی گلی والا دروازہ کھول دیا اور پھر بُرش سنبھال کر ایک کینوس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ جس پر ایک ادھوری پینٹنگ بنی ہوئی تھی۔ نصف اسکیچ میں، میں رنگ بھر چکا تھا۔ جب کہ ابھی نصف اسکیچ باقی تھا۔ تصویر میں رنگ بھرتے ہوئے مجھے ابھی چند ہی لمحات گزرے تھے کہ معاً میری سماعتوں سے ایک دل کش نسوانی آواز ٹکرائی۔"میری چھوٹی بہن کو ٹیوشن پڑھاؤ گے؟"

میں نے کینوس سے نظر ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا تو ایک وہاں ایک بہت ہی خوب صورت اور نوعمر لڑکی کو موجود پایا۔ ''کون ہو تم؟'' میں نے قدرے درشت انداز میں پوچھا۔

''میں چندا ہوں۔ ڈاکٹر کمال حسین کی بڑی بیٹی۔ ویسے میرا اصل نام سندس کمال ہے۔ مگر امی مجھے پیار سے چندا کہتی ہیں۔'' اُس نے جھٹ سے جواب داغا۔

''عمر کیا ہے تمہاری؟'' مجھے اُس کی خوداعتمادی پہ غصہ آ گیا۔

''بارہ سال، چھ ماہ اور بیس دن۔ اور کچھ پوچھنا ہے کیا؟'' اُس کی خوداعتمادی میں ذرا بھی کمی نہیں آئی تھی۔

''اور میری عمر کیا ہوگی؟''

''ہوگی کوئی بیس سال یا پھر............'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ دوبارہ بولی۔ ''زیادہ سے چوبیس سال ہوگی۔''

''او کے تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ اب بتاؤ تم کیا کہہ رہی تھیں؟'' اس بار میں نے مسکرا کر پوچھا۔

''تم کیا اُونچا سنتے ہو یا پھر میری آواز تمہیں پسند آ گئی ہے۔ اس لیے بار بار سننا چاہتے ہو؟'' اُس نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔

''تم مجھے ''تم'' کہہ رہی ہو؟'' میں غصے سے کھول اُٹھا۔ ''مشہور و معروف مصور شہیر حسن راجا کو، احمق لڑکی! میں تم سے عمر میں پورے دس سال بڑا ہوں۔ اور تم سے کس بے وقوف نے کہہ دیا ہے کہ تمہاری آواز خوب صورت اور سُریلی ہے؟ کوے کے جیسی اس کرخت آواز کو میں بھلا کیوں پسند کرنے لگا؟ بڑوں سے کیا اس طرح بات کی جاتی ہے۔ کمال صاحب نے کیا تمہیں یہی..................''

''اے اے...... باپ کا نام مت لو۔'' اُس نے قطع کلامی کی۔ ''تم بھی تو بار بار مجھے ''تم'' کہہ رہے ہو، میں نے کہہ دیا تو کون سی قیامت آ گئی؟ اور میری آواز کی تو سب تعریف کرتے ہیں۔ سکول کی ساری فرینڈز میری آواز کی گرویدہ ہیں۔ روزانہ فرمائش کر کے مجھ سے گانے سنتی ہیں۔ لیکن تم کیا جانو خوب صورتی اور بدصورتی کا معیار؟ ہیرے کی پرکھ جوہری کو ہوتی ہے۔ تم ٹھہرے نرے مصور، رنگوں اور بُرش نے مت ماردی ہے تمہاری۔ اس مشغلے نے تمہیں اس قابل چھوڑا ہی کہاں ہے کہ تم کسی کی آواز پر توجہ دے سکو۔''

''تیری فرینڈز تجھے اُلو بناتی ہیں۔ پیٹھ پیچھے تیری بھدی آواز کا مذاق اُڑاتی ہوں گی مس سندس کمال۔''

''اُلو بنائے نہیں جاتے بنے بنائے مل جاتے ہیں۔ بس ڈھونڈنے کی زحمت کرنا پڑتی ہے۔'' اُس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''لو بھئی اینگری ینگ مین۔'' میں نے بے چارگی کے عالم میں سر کھجایا۔ ''بہت ڈراتے پھرتے تھے لوگوں کو، اس بارہ سالہ اینگری وومین کو ڈرا کر دکھاؤ تو مانیں؟''

''اوہ........ تو لوگ ڈرتے ہیں تم سے، تم کیا ''رام جانے'' کے شاہ رخ خان ہو؟'' اُس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے پوچھا۔

''تھوڑی دیر پہلے تک تو یہی سمجھتا تھا مگر اب نہیں۔'' میں نے سر کو دائیں سے بائیں ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم تو مس کلاشنکوف ہو، تمہاری تڑتڑاہٹ نے مجھے خوف زدہ کر دیا ہے۔''

''گانا سناؤں کیا؟'' اُس نے یوں پوچھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں نے پہلی بار اُس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ بلاشبہ وہ لاکھوں میں نہیں بلکہ کروڑوں میں ایک تھی۔ کسی ہرنی کے جیسی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، باریک باریک سرخ ہونٹ جیسے گلاب کی پتیاں۔ بیضوی چہرہ اور صراحی دار گردن۔ اُس کے لبوں پر ایک ایسی دل کش مسکراہٹ رقصاں تھی کہ چند لمحوں کے لیے تو میں مبہوت رہ گیا۔ اُس نے اپنی عمر ساڑھے بارہ سال بتائی تھی۔ مگر وہ کسی طرح بھی سولہ سال سے کم کی نظر نہیں آتی تھی۔ وہ سکول یونی فارم میں ملبوس تھی۔ اُس کے ملکوتی حُسن نے مجھے وقتی طور پر سحر زدہ سا کر دیا تھا۔ مگر پھر میری انا آڑے آ گئی۔ میں نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''سوری مس سندس کمال! میرے پاس ایسے فضول کاموں کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''اوہ........'' اُس نے ہونٹ سکیڑے۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بدذوق نکلو گے؟ چلو کوئی بات نہیں ہے۔ اب یہ بتاؤ کہ میری بہن کو ٹیوشن پڑھاؤ گے کہ نہیں؟''

''سوری...... یہ بھی مجھ سے نہیں ہوگا۔''

وہ چند لمحے مجھے غصے کے عالم میں گھورتی رہی۔ پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے میں تجھے دیکھ لوں گی۔''

پھر اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا وہ پاؤں پٹختے ہوئے باہر نکل گئی۔

☆......☆......☆

رات کے کھانے کے بعد اماں نے برتن سمیٹ کر کچن میں رکھے اور پھر واپس آ کر مجھ سے بولیں۔ ”راجا پتر! ایک گزارش ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔“

میں نے کہا۔ ”اماں! آپ حکم تو کریں، میں بھلا انکار کر سکتا ہوں؟“

”پتر! آج وہ ڈاکٹر کمال کی بیوی ہمارے گھر آئی تھی۔ وہ یہاں لڑکیوں کے سکول میں پڑھاتی ہے۔ بچارے شہر سے ہجرت کر کے ہمارے گاؤں میں آئے ہیں۔ بہت ہی اچھے اور خاندانی لوگ ہیں۔ اُن کی ایک بچی پڑھنے لکھنے میں قدرے کم زور ہے۔ وہ لوگ چاہتے ہیں کہ تم اُسے ٹیوشن پڑھا دیا کرو۔“

”اوہ.......اب میں سمجھا۔“ میں نے چونک کر کہا۔ ”تو وہ محترمہ اپنی امی کے ساتھ تشریف لائی تھی؟“

”کون محترمہ؟“

”وہی جو گلی والے دروازے سے میرے سٹوڈیو میں گھس آئی تھی۔“

اماں بولیں۔ ”اچھا......اچھا......وہ چندا......بھئی! بہت ہی پیاری اور ذہین بچی ہے۔ کیا کہہ رہی تھی تم سے؟“

میں نے کہا۔ ”اماں! وہ مجھے دھمکی دے کر گئی ہے۔“

”کیسی دھمکی؟“ اماں کے لہجے میں تحیر تھا۔

”یہی کہ اگر میں نے اُس کی چھوٹی بہن کو نہ پڑھایا تو وہ یعنی کہ محترمہ چندا صاحبہ مجھ سے نمٹ لیں گی۔“

اماں نے ہنس کر کہا۔ ”بھئی! بہت خوب بڑی دلیر گڑی ہے۔ جی چاہتا ہے اُسے اپنی بہو بنا لوں؟“

”اماں! وہ اتنی سی تو ہے۔“ میں نے ہاتھ سے اُس کا سائز بتایا۔ ”اور آپ چلی ہیں اُسے اپنی بہو بنانے، لوگ کیا کہیں گے؟“

”ہاں بھئی! یہی تو مسئلہ ہے۔ ورنہ وہ واقعی چاند کے جیسی ہے۔ کاش وہ تیری ہم عمر ہوتی تو میں آج ہی اُستانی صاحبہ سے تمہارے لیے اُس کا ہاتھ مانگ لیتی۔“

میں نے شرارت سے کہا۔ ”اماں! کیا میں اُس کے ہاتھ سے شادی کروں گا؟ مانگنا ہی ہے تو پھر پوری

لڑکی مانگو، ہاتھ کا میں کیا کروں گا؟"

"اچھا یہ بتاؤ تجھے وہ کیسی لگتی ہے؟" اماں نے سوال کیا۔

"اماں! میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟"

"راجا! تم بچے تو نہیں ہو کہ اتنی سی بات بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی؟"

میں نے ایک دم سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "اماں! یاسمین کی جگہ کوئی بھی پُر نہیں کر سکتا۔ آپ یہ خیال بھی ذہن سے نکال دیں کہ یاسمین کے بعد کوئی میری زندگی میں آئے گا؟"

"مجھے لگتا ہے میں یہ آس دل میں لے کر دنیا سے جاؤں گی۔"

"کاش اماں! میرا دل پہ اختیار چلتا۔" میں نے اُداسی کے عالم میں جواب دیا۔

"اچھا چھوڑو۔" اماں نے موضوع بدل دیا۔ "تم یہ بتاؤ فائزہ کو پڑھاؤ گے کہ نہیں؟"

"اگر یہ آپ کا حکم ہے تو پھر میں اس سے انکار نہیں کروں گا۔ ورنہ ایک بچی کے ساتھ سر کھپانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

اماں بولیں۔ "یہ حکم نہیں ہے۔ البتہ تم اسے میری خواہش سمجھ سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اگر یہ آپ کی خواہش ہے تو میں انکار نہیں کروں گا۔ آپ اُن سے کہہ دیں کہ وہ بچی کو حویلی بھیج دیا کریں۔ میں اُسے پڑھا دیا کروں گا۔ ویسے اُستانی صاحبہ خود بھی تو اپنی بچی کو پڑھا سکتی ہیں؟"

"یہ بات میں نے اُس سے کہی تھی۔ اُس کا کہنا تھا کہ بچے اپنے والدین سے سنجیدگی کے ساتھ نہیں پڑھتے۔" اماں نے جواب دیا اور پھر عشاء پڑھنے کے لیے وضو کرنے چل دیں۔

☆......☆......☆

دوسرے دن ظہر کی نماز کے بعد گلے میں سکول بیگ ڈالے ایک گول مٹول سرخ و سفید سی بچی اماں کی معیت میں میرے کمرے میں داخل ہوئی اور مجھے سلام کرنے کے بعد بولی۔ "کیا میں آپ کو بھیا کہہ سکتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "بڑے شوق سے بھئی! یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ ویسے تمہارا نام کیا ہے؟"

''نام فائزہ کمال، عمر دس سال پندرہ دن اور پانچویں کلاس میں پڑھتی ہوں۔'' اُس نے مشینی انداز میں جواب دیا تو میری ہنسی چھوٹ گئی۔

''یہ کیا بھیا! میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟'' اُس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں حیرت تھی۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔'' میں نے تو صرف تمہارا نام پوچھا تھا۔تم نے تو ساری معلومات ہی فراہم کر دیں؟''

''اوہ......تو یہ بات ہے؟'' اُس نے سر ہلایا۔'' لیکن یہ سب کچھ تو میں نے چندا باجی کے کہنے پر کیا ہے۔''

''مطلب اس طریقے سے تعارف کرانے کا تجھے چندا نے کہا تھا؟''

''ہاں جی اُسی نے کہا تھا۔آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں نا؟''

اُس نے کچھ اتنی معصومیت سے پوچھا کہ مجھے بے اختیار اُس پہ پیار آ گیا۔ویسے بھی وہ بے حد حسین و جمیل تھی۔صاف ستھری نکھری نکھری۔چھوٹی سی پونی ٹیل کے ساتھ وہ پرستان کی پری لگ رہی تھی۔میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھئی! اس میں خفا ہونے والی کون سی بات ہے۔بھلا کوئی اپنی بہن سے بھی خفا ہو سکتا ہے؟''

وہ بولی۔'' ارے آپ تو بہت ہی اچھے ہیں۔چندا باجی نے شاید مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔''

''کیسا جھوٹ بھئی؟'' میں نے دل چسپی کا مظاہرہ کیا۔

''یہی کہ آپ بہت کڑک اور غصے والے ہیں اور یہ کہ آپ......آپ.......'' وہ کچھ کہتے کہتے ایک دم خاموش ہو گئی۔

ایسے ہی وقت اماں نے مداخلت کی۔'' تم لوگ ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرو میں اتنی دیر تک چائے بنا لیتی ہوں۔''

اتنا کہہ کر اماں باہر نکل گئیں جب کہ میں دوبارہ فائزہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔'' ہاں بھئی! تم کچھ چندا کے بارے میں بتا رہی تھیں؟''

وہ بولی۔'' پہلے آپ پرامس کریں کہ چندا باجی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔پھر بتاؤں گی۔''

"اوکے بھئی! میں پرامس کرتا ہوں کہ تمہاری باجی چندا کو کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔"

اُس نے رازدارانہ انداز میں میرے کان کے نزدیک منہ لاتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں بتایا۔"چندا باجی کہتی ہے کہ آپ بہت مغرور ہیں۔ اتنے کہ کسی سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے ہیں۔"

"اچھا........" میں نے یوں حیرت کا اظہار کیا جیسے اُس نے کوئی بہت بڑا انکشاف کر دیا ہو۔"بھئی! یہ چندا تو ایک نمبر کی جھوٹی ہے۔ اتنا بڑا جھوٹ تو آج تک کسی سیاست دان نے بھی نہیں بولا ہوگا۔ مجھے لگتا ہے یہ بڑی ہو کر سیاست دان بنے گی؟"

"اوں ہوں۔" اُس نے گردن کو دائیں بائیں ہلایا۔"امی کہتی ہیں کہ وہ بڑی ہو کر دلہن بنے گی۔"

مجھے ایک بار پھر سے ہنسی آگئی اور وہ معصومیت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔"فائزہ! وہ کس کی دلہن بنے گی؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم، لیکن آپ فکر نہ کریں میں امی سے معلوم کر کے آپ کو بتا دوں گی۔"

میں نے کہا۔"ٹھیک ہے۔ مگر امی کو یہ مت بتانا کہ یہ بات راجا بھیا نے پوچھی ہے؟"

"بالکل نہیں بتاؤں گی۔"

"اوکے اب کتاب نکالو سبق پڑھتے ہیں۔"

وہ تقریباً عصر کے وقت تک مجھ سے پڑھتی رہی۔ اس کے بعد چھٹی لے کر رخصت ہوگئی۔



وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس شہری فیملی سے ہمارے تعلقات بڑھتے گئے۔ اماں نے اُستانی صاحبہ کو اپنی منہ بولی بہن بنا لیا تھا۔ جب کہ بابا اور ڈاکٹر کمال کے درمیان بھی گاڑھی چھننے لگی تھی۔ اس دوران فائزہ مجھ سے باقاعدگی کے ساتھ پڑھتی رہی تھی۔ سکول میں اب اُس کا شمار ذہین ترین طالبات میں ہونے لگا تھا۔ فائزہ کے ساتھ ساتھ چندا سے بھی میری دوستی ہوگئی تھی۔ ہماری ملاقات تقریباً ہر روز ہوتی تھی۔ دونوں بہنوں کو میں شاپنگ بھی کروا دیا کرتا تھا۔ میرے پاس چونکہ روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس لیے وہ جو بھی فرمائش کرتی تھیں میں فوراً پوری کر دیتا تھا۔ اُن دونوں کے ساتھ رہ کر میں یاسمین کا غم بڑی حد تک بھول چکا

تھا۔مگر پھر بھی کبھی کبھار تنہائی میں اُس کی یادیں مجھے گھیر لیتی تھیں۔تب میں اپنے سٹوڈیو میں جا کر یہ غم بھلانے کی سعی کرتا رہتا تھا۔

چندا اُن دنوں میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی اور عمر کی سولہویں سیڑھی پر پاؤں رکھ چکی تھی۔اُسے دیکھ کر اب مجھے کچھ کچھ ہونے لگتا تھا۔مگر میں عمر کے تفاوت کی وجہ سے اظہار کرنے سے جھجکتا رہتا تھا۔دوسرا میں ابھی تک یاسمین کو بھی پوری کوشش کے باوجود بھلا نہیں پایا تھا۔سو میری زندگی اسی کش مکش کے عالم میں بسر ہو رہی تھی۔دل و دماغ میں ایک جنگ سی چھڑی رہتی تھی۔کبھی دل چاہتا تھا کہ چندا سے اپنے جذبات کا اظہار کر دوں۔اُسے کہہ دوں کہ میں اُس سے پیار کرنے لگا ہوں۔مگر عقل کہتی تھی کہ خبردار! یہ حماقت مت کرنا وہ تم سے عمر میں چھوٹی ہے۔بُرا مان گئی تو اُس کی دوستی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔تب میں عقل کی مان کر چپ سادھ لیتا تھا۔شاید مجھ میں ایک اور زخم سہنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔میں نہیں چاہتا تھا کہ یاسمین کی طرح چندا بھی وقت کی گرد میں کہیں گم ہو جائے اور میں دوسری بار بھی تہی دست رہ جاؤں۔

غالباً وہ اتوار کا دن تھا۔صبح کے تقریباً نو بجے میں سٹوڈیو میں داخل ہوا اور ایک ادھوری تصویر میں رنگ بھرنے لگا۔یہ یاسمین کی تصویر تھی۔چنانچہ میں ہمیشہ گلی والا دروازہ بند کر کے ہی اُس تصویر پہ کام کیا کرتا تھا۔دراصل میں اُس تصویر کو سب سے چھپا کر رکھنا چاہتا تھا۔مگر بدقسمتی سے مجھے اُس روز گلی والا دروازہ بند کرنا یاد ہی نہ رہا۔میں اپنے کام میں اس قدر منہمک تھا کہ مجھے اُس کے آنے کا پتا ہی نہ چل سکا۔وہ شاید دبے پاؤں اندر داخل ہوئی تھی۔

''راجا! یہ کس چڑیل کی تصویر بنا رہے ہو؟'' میری سماعتوں سے اچانک اُس کی مدھر آواز ٹکرائی۔

''چندا......تم......؟'' میں بوکھلا کر پیچھے پلٹا۔''خیر......خیریت تو ہے۔کیسے آنا ہوا؟''

''ویسے ہی جیسے پہلے''آنا''ہوتا تھا۔'' اُس نے لفظ''آنا''پر زور دیتے ہوئے کہا۔''مگر تم کیوں بدحواس ہوئے جا رہے ہو۔کہیں تمہاری چوری تو نہیں پکڑی گئی؟''

''چوری......کک......کون سی چوری؟''

''چلو مٹی پاؤ چوری تے، یہ بتاؤ یہ چڑیل کون ہے؟'' وہ ایسی ہی تھی۔پل میں تولہ پل میں ماشہ۔

میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''یہ بس ایسے ہی خیالی تصویر ہے۔تم کہو گی تو تمہاری بھی بنادوں گا۔''

''اوں ہوں۔'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں بنانی تصویر۔لکڑی کے اسٹول پہ بیٹھے رہو سارا دن کسی اُلو کے مانند۔''

''اوکے جیسے تمہاری مرضی۔تم بیٹھو میں تمہارے لیے اماں سے چائے کا کہہ دیتا ہوں۔'' میں نے بغلی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''چینی کم دودھ زیادہ۔'' وہ یوں تحکمانہ انداز میں بولی جیسے کسی ویٹر سے مخاطب ہو۔

''جو حکم میڈم جی۔'' میں نے قدرے سر جھکا کر اُسے تعظیم دی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

موتیوں کے جیسے صاف سفید اور چمک دار دانت دیکھ کر بے اختیار مجھے اُس پر پیار آنے لگا۔وہ واقعی چاہے جانے کے قابل تھی۔یاسمین کو بھلانے میں اُس کی من موہنی صورت نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ویسے تو اُس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں، میں پہلے دن سے ہی ڈوب گیا تھا۔یہ الگ بات تھی کہ اظہار آج تک نہیں کر پایا تھا۔ نجانے یہ اُس کا رعب حسن تھا کہ میری بزدلی؟ میں آج تک نہیں سمجھ سکا تھا۔

میں نے اندر جا کر اماں سے جب چائے بنانے کا کہا تو وہ ہنستے ہوئے بولیں۔

''کیا کوئی خاص مہمان آیا ہے؟''

''چندا ہے اماں۔''

''تو بھئی اُسے اندر لے آؤ نا! جوان لڑکی ہے کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟''

''گلی والا دروازہ بند ہے اماں! کسی کے دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

''راجا! سچ بتاؤ وہ تجھے اچھی لگتی ہے نا؟'' اماں نے خوش ہو کر پوچھا۔

''پتا نہیں اماں! میں اب تک اُسے سمجھ نہیں پایا۔وہ بہت اُلجھی ہوئی لڑکی ہے۔کبھی تو مجھے بہت ہی اچھی لگتی ہے اور کبھی کبھی بہت بُری۔''

''یہ کیا بات ہوئی بھلا؟'' اماں کے انداز میں حیرت تھی۔

''میں نے جو محسوس کیا آپ کو بتا دیا۔'' جواب دے کر میں واپس سٹوڈیو کی طرف چل پڑا۔

جونہی میں نے سٹوڈیو کے اندر قدم رکھا، ٹھٹک کر رک گیا۔ چندا برش ہاتھ میں لیے یاسمین کی ادھوری تصویر کا حلیہ بگاڑنے میں مصروف تھی۔ میری ساری محنت اُس نے پل بھر میں خاک میں ملا کر رکھ دی تھی۔ میں چند لمحے تو اُسے حیرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں دیکھتا رہا۔ پھر چلا کر بولا۔ ''احمق لڑکی! یہ کیا کر دیا تم نے۔ میری ساری محنت پہ پانی پھیر کر کیا ملا تمہیں؟ مجھے لگتا ہے تم میں ذرا بھی عقل نہیں ہے جاہل کہیں کی۔''

اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر خوف زدہ ہو کر برش پھینک دیا۔ ''سس......سوری جی......مم مجھ سے غلطی ہو گئی جی......''

''چپ......سوری کی بچی!'' میں نے گرج کر قطع کلامی کی۔ ''حماقت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں تم سے ذرا ہنس کر کیا بول لیتا ہوں، تم تو سر پر ہی چڑھنے لگی ہو۔''

''مم......میں......'' اُس کے ہونٹ بولنے کے انداز میں لرز کر رہ گئے اور موٹی موٹی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ دوسرے ہی پل اُس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

میں نے ایک نظر اُس کے چہرے پر ڈالی تو اُس کی نمناک آنکھوں میں ہزاروں شکوے تھے۔ چہرے سے پھسلتی ہوئی میری نظر اُس کے جُڑے ہوئے ہاتھوں پر آ کر ٹھہر گئی۔ مجھے ایک دم ندامت کا احساس ہوا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''سوری چندا! مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں تم سے سخت شرمندہ ہوں۔''

''نن......نہیں جی......آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ایک زخمی سی نگاہ میرے چہرے پر ڈالی اور پھر تیزی سے پلٹ کر دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔

''رکو چندا! میری بات سنو۔'' میں نے تڑپ کر کہا مگر اُس نے پلٹ کر پیچھے نہیں دیکھا۔

مجھے ایک دم پشیمانی کے احساس نے گھیر لیا۔ آج پہلی بار اُس نے مجھے ''تم'' کے بجائے ''آپ'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میں دیر تک پشیمانی کے عالم میں اُس کے بارے میں سوچتا رہا۔ دل چاہتا تھا کہ ابھی اُس کے پاس جا کر اُس کے پیروں میں گر کر معافی مانگ لوں۔ میں نے اُس کا ننھا سا دل بڑی بے دردی سے توڑ دیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ معاً میں اُٹھا اور کینوس سے یاسمین کی تصویر نوچ کر پُرزے پُرزے کر ڈالی۔

اماں جب چائے کی ٹرے تھامے اندر داخل ہوئیں تو میری حالت دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔

''راجا! یہ...... یہ کیا حالت بنا رکھی ہے بیٹے؟'' اماں کے لہجے سے پریشانی جھلکنے لگی۔'' اور وہ...... وہ چندا کہاں چلی گئی ہے؟''

''وہ...... گھر چلی گئی ہے اماں۔'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اماں کی حیرت دوچند ہوگئی۔ اُس نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور اپنی اوڑھنی سے میرے رخسار صاف کرتے ہوئے بولیں۔'' بیٹے! بات کیا ہے۔ مجھے بتاؤ تو سہی، کیا چندا اور تمہارے بیچ لڑائی ہوئی ہے؟''

میں نے کہا۔'' اماں! میں نے اُس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ اُس کے مان اور پندار کے بت کو پاش پاش کردیا ہے۔ محض ایک معمولی سی غلطی کی پاداش میں۔ وہ یہاں سے روتے ہوئے گئی ہے۔ میں اُس کا مجرم ہوں۔''

''نا بیٹے نا! روتے نہیں۔'' اُنھوں نے مجھے دلاسا دیا۔'' مجھے بتاؤ تم دونوں کا جھگڑا کس بات پر ہوا ہے؟''

''اماں! وہ مجھ سے روٹھ کر گئی ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے سارا واقعہ اماں کو سنا دیا۔

اماں نے کہا۔'' بس اتنی سی بات پر تم نے رونا شروع کردیا ہے؟''

''یہ معمولی بات نہیں ہے اماں! میں نے ایک پل میں ہزاروں شکوے دیکھے ہیں اُس کی آنکھوں میں۔ اب وہ مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔''

''فکر نہ کرو میں اُسے منا کرلاؤں گی۔ تم یہ چائے پیو۔''

''نہیں اماں۔'' میں نے انکار میں سر ہلایا۔'' جس کے لیے منگوائی تھی۔ وہ تو روٹھ کر چلی گئی، میں اکیلے پی کر کیا کروں گا؟''

''اچھا ٹھیک ہے میں اُسے منا کرلاتی ہوں۔'' اماں نے ٹیبل سے ٹرے اُٹھائی اور واپسی کے لیے مڑ گئیں۔

اماں کی واپسی تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ہوئی۔ میں بے چینی کے عالم میں اپنے کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اماں نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بولیں۔

''راجا! چندا تو گھر میں موجود نہیں تھی۔ تاہم میں نے اُستانی صاحبہ سے تمہاری سفارش کر دی ہے۔''

''اُنھوں نے یہ نہیں بتایا کہ چندا کہاں ہے؟'' میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''وہ اپنے ابو کے ساتھ ذرا شہر تک گئی ہے۔ شام تک لوٹ آئیں گے۔''

☆......☆......☆

حسبِ معمول ظہر کے وقت جب فائزہ پڑھنے کے لیے آئی تو میں نے جھٹ سے سوال کیا۔ ''فائزہ! کیا چندا شہر سے واپس آ گئی ہے؟''

وہ بولی۔ ''بھیا! چندا کبھی کبھی وہیں دادا ابو کے گھر میں رہ جاتی ہے۔ کیا پتا وہ آج بھی واپس نہ آئے؟''

''نہیں آج وہ ضرور واپس آئے گی۔''

''آپ کو کوئی کام ہے اُس سے؟'' فائزہ نے سوال کیا۔

''نہیں کام تو کوئی نہیں ہے۔ بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔''

''مجھے لگتا ہے۔ آپ کچھ چھپا رہے ہیں؟'' اُس نے ذو معنی انداز میں مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں گڑیا! یہ تمہارا وہم ہے۔ میرے اور چندا کے بیچ ایسا کیا ہے جو میں چھپاؤں گا؟''

وہ مسکرائی۔ ''آپ کی بے چینی بتا رہی ہے کہ آپ دونوں کے بیچ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ ورنہ اس سے قبل تو میں نے کبھی آپ کو اس قدر پریشان نہیں دیکھا۔''

وہ اب بچی نہیں رہی تھی۔ پندرہویں برس میں قدم رکھنے والی تھی۔

''وہ دراصل میرے اور اُس کے بیچ کچھ تلخ کلامی ہو گئی تھی تو وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلی گئی۔ اس کے علاوہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔''

''تلخ کلامی کس بات پر ہوئی تھی؟''

''اُس نے جان بوجھ کر میری ایک ادھوری تصویر کو خراب کر دیا تھا۔ مجھے غصہ آیا تو میں نے اُسے جھڑک دیا۔ پھر وہ روتے ہوئے چلی گئی۔''

''وہ بہت مکار ہے بھیا!'' فائزہ نے قہقہہ لگایا۔ ''اُس کے آنسوؤں پر کبھی مت جانا ورنہ مارے

جاؤ گے۔ وہ جھوٹ موٹ روتی ہے۔‘‘

میں نے کہا۔’’جھوٹ موٹ رونے سے آنسو تھوڑی بہتے ہیں؟‘‘

وہ بولی۔’’آپ اُسے اداکارہ سمجھ لیں بھیا! اُس کا ہنسنا رونا، غم و خوشی، خلوص و کینہ، بے زاری و دل چسپی سب کچھ اداکاری ہوتا ہے۔ آج تک اُسے ابو اور امی نہیں سمجھ پائے تو آپ کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ وہ دل کی بات کسی کو بھی نہیں بتاتی۔‘‘

میں نے مشکوک انداز میں کہا۔’’مجھے لگتا ہے۔ اب تم جھوٹ بول رہی ہو؟‘‘

’’یہ سو فی صد سچ ہے۔ آپ کو بہت جلد اس کا اندازہ ہو جائے گا۔‘‘

فائزہ تو ٹیوشن پڑھ کر چلی گئی مگر مجھے سوچوں کی سولی پر لٹکا گئی۔ میں کتنی ہی دیر تک چندا کے متعلق سوچتا رہا۔ اپنی من موہنی صورت اور باتوں سے وہ مجھے بالکل ایسی نہیں لگتی تھی۔ مگر میں فائزہ کی بات کو بھی تو نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ فائزہ اُس کی بہن تھی۔ وہ دن رات اکٹھے رہتی تھیں۔ ظاہر ہے وہ چندا کے متعلق مجھ سے زیادہ جانتی تھی۔ جوں جوں میں سوچتا گیا میری پریشانی بڑھتی گئی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی چندا کے متعلق اس قدر سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچا تھا۔ میرا دل جو کل تک یاسمین کے نام پر دھڑکتا تھا۔ آج اُس کی ہر دھڑکن چیخ چیخ کر’’چندا چندا‘‘ پکار رہی تھی۔ اُس وقت مجھے چندا پر بے تحاشا پیار آرہا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ اُڑ کر اُس کے پاس پہنچ جاؤں، مگر یہ ممکن نہیں تھا کہ اس میں چندا کی رسوائی تھی۔ اُس دن پہلی بار مجھ پر منکشف ہوا کہ میں تو چندا سے پیار کرتا ہوں۔

دوسرے دن میں صبح سویرے ہی گرلز سکول کی طرف نکل گیا۔ اس اُمید پر کہ شاید رستے میں کہیں چندا سے ملاقات ہو جائے۔ مگر اپنی اس کوشش میں مجھے ناکامی ہوئی تھی۔ البتہ سکول کے باہر میں نے فائزہ کو ضرور دیکھا تھا۔ جو نزدیکی بک شاپ سے کچھ خریدنے آئی تھی۔ میں اُس وقت موٹر بائیک پہ سوار تھا اور بک شاپ کے قریب ہی موجود تھا۔ فائزہ کی نظر جونہی مجھ پر پڑی، وہ چہرے پہ مسکراہٹ سجائے میرے قریب آگئی۔’’بھیا! خیر تو ہے صبح صبح گرلز سکول کے گرد کیوں منڈلا رہے ہو؟‘‘ اُس نے شرارتی انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔’’تم غلط سمجھ رہی ہو، میں تو ویسے ہی ادھر سے گزر رہا تھا۔ تمہیں دیکھا تو رک گیا۔‘‘

وہ مسکرائی۔ ”پہلے تو آپ نے کبھی اس طرف کا چکر نہیں لگایا۔ آج کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”ہاں بس پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا۔ دراصل میں زیادہ وقت گھر میں ہی گزارتا ہوں۔“

”لگتا ہے آج کسی کی یاد ستا رہی تھی؟“ اُس نے ذومعنی انداز میں سوال کیا۔

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”دراصل مجھے چندا سے کچھ کہنا تھا۔ مگر وہ تو کہیں..........“

”وہ آج سکول نہیں آئی۔“ فائزہ نے قطع کلامی کی۔ ”کہہ رہی تھی کہ میری طبیعت خراب ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ اُس نے ہمیشہ کی طرح جھوٹ بولا ہے۔“

میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”وہ ٹھیک تو ہے نا! کہیں سچ مچ بیمار تو نہیں ہے؟“

”آپ بہت سادہ ہیں بھائی!“ وہ ناصحانہ لہجے میں بولی۔ ”چندا بہت مکار ہے۔ میں جانتی ہوں کہ وہ یہ کھیل کس لیے رچا رہی ہے؟ پلیز اُس کی باتوں میں نہ آئیں وہ آپ کے جذبات سے کھیل رہی ہے۔“

”میں سمجھا نہیں تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“ میں نے قدرے اُلجھ کر پوچھا۔

وہ بولی۔ ”میں جب ٹیوشن پڑھنے آؤں گی تو آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔ ابھی سکول لگنے والا ہے۔“

”اوکے میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ میں نے جواب دیا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے سکول کی طرف چل دی۔

میں چند لمحے تو وہیں پریشانی کے عالم میں کھڑا رہا۔ پھر بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گھر پہنچ کر میں نے برآمدے کے سامنے موٹر بائیک روک دی اور اماں کو آوازیں دیتا ہوا کچن کی بڑھ گیا۔

☆......☆......☆

کچن کے دروازے پر پہنچتے ہی میں ٹھٹک کر رک گیا۔ عین دروازے کے سامنے چندا ایک چوبی اسٹول پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اُسے یوں اچانک اپنے سامنے پا کر میرا دل بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ ایسے ہی وقت میری سماعتوں میں فائزہ کی آواز گونجی۔ ”لیکن میں جانتی ہوں کہ اُس نے ہمیشہ کی طرح جھوٹ بولا ہے۔ آپ اُسے اداکارہ سمجھ لیں بھیا۔ وہ دل کی بات کسی کو بھی نہیں بتاتی۔“

چندا کو بالکل تندرست دیکھ کر نجانے کیوں مجھے فائزہ کی باتیں سچ لگنے لگی تھیں۔ اُس کی طبیعت اگر ناساز

ہوتی تو پھر یہاں ہمارے گھر میں اُس کی موجودگی کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ ’’کیا یہ واقعی اداکارہ ہوسکتی ہے؟‘‘ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور پھر اُس کی معصوم صورت پر نظر ڈالی تو مجھے اپنی اس سوچ پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ وہ اماں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی لیکن مجھے دیکھ کر ایک دم خاموش ہوگئی۔ میں نے آگے بڑھ کر سلام کیا تو اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ تاہم اماں نے نہ صرف میرے سلام کا جواب مسکرا کر دیا بلکہ ڈھیر ساری دعائیں بھی دیں۔

میں نے ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ’’اماں! کیا اس محترمہ کے بولنے پر کسی نے پابندی لگا کر رکھی ہے؟‘‘

’’نہیں بھئی! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔‘‘ اماں مسکرائی۔ ’’البتہ تم سے ناراض ہو تو میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ خود ہی پوچھ لو۔‘‘

’’سوری چندا! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ کل میں نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔‘‘

اُس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر ایک دم اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ’’اچھا آنٹی! اب میں چلتی ہوں۔‘‘ وہ اماں سے اجازت طلب انداز میں مخاطب ہوئی۔ ’’امی نے جلدی آنے کو کہا تھا۔‘‘

اماں بولیں۔ ’’ارے یہ کیا بیٹی! ابھی تو آئی ہو کچھ دیر تو بیٹھو۔‘‘

’’نہیں آنٹی! دیر ہو جائے گی۔ امی ناراض ہوں گی۔ میں پھر کسی وقت چکر لگا لوں گی۔‘‘ اُس کے لہجے میں اضطراب تھا۔

’’ٹھیک ہے بیٹی! تم چند منٹ ٹھہر جاؤ، میں ابھی آتی ہوں۔‘‘ اتنا کہہ کر اماں کچن سے باہر نکل گئیں۔

’’چندا!‘‘ اماں کے جاتے ہی میں نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ’’پلیز........ مجھے معاف کردو، میں تم سے بے حد شرمندہ ہوں۔ پرامس کہ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کروں گا۔ نجانے کل مجھے کیا ہوگیا تھا؟‘‘

’’شہیر صاحب! میں آپ سے خفا نہیں ہوں۔ آپ بلاوجہ میرے سامنے ہاتھ نہ جوڑیں۔ ویسے بھی غلطی میری تھی۔‘‘ اُس نے سپاٹ انداز میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ’’چاند! پلیز یوں اجنبی ہو کر تو بات نہ کرو۔ مجھے تمہارے منہ سے ’’تم‘‘ سننا اچھا لگتا

ہے۔ شہیر صاحب کہہ کر میرا دل کیوں دکھاتی ہو؟''

وہ بولی۔'' آپ ٹھہرے ایک جاگیردار جب کہ میں ایک عام سی لڑکی ہوں۔ مجھے وہ خواب مت دکھائیں جن کی تعبیر صرف راکھ ہوتی ہے۔''

'' چاند! میں...... میں تم سے...... بہت زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اتنا زیادہ کہ تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتیں۔'' میرا لہجہ کانپ رہا تھا۔

'' لیکن میں نے کبھی آپ کے بارے میں نہیں سوچا۔ آپ یک طرفہ محبت کا شکار ہیں۔'' اُس نے بے رخی سے جواب دیا۔

'' پپ...... پلیز چاند! بھیک میں ہی سہی لیکن مجھے تمہارا پیار چاہیے۔ تم میرے ماضی کے زخموں کا مداوا کر سکتی ہو۔''

اچانک اُس نے مجھے آگ برساتی نگاہوں سے گھورا اور پھر روکھے انداز میں بولی۔'' میں ایک جیتی جاگتی لڑکی ہوں۔ مرہم یا میڈیسن نہیں ہوں کہ آپ کے زخموں کا مداوا کرتی پھروں؟''

'' وہ میرا ماضی تھی چاند اور تم حال ہو۔ میں حال میں جینا چاہتا ہوں۔''

'' تو پھر ماضی کو سینے سے کیوں لگا رکھا ہے مسٹر شہیر حسن راجا؟'' اُس نے زہریلے لہجے میں پوچھا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر چل دی۔

'' رکو چاند! میری بات سنو۔'' میں چلایا مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے حویلی کا مین گیٹ کراس کر گئی۔

اسی دوران اماں بھی واپس آگئیں۔ چندا کو غائب پا کر انھوں نے جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے مایوسی سے سر جھکا دیا۔

اماں نے کہا۔'' مجھے لگتا ہے تم نے پھر اُسے ناراض کر دیا۔''

'' نہیں اماں!'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔'' وہ خود ہی ناراض ہو کر چلی گئی ہے۔ حالانکہ میں تو اُس سے اپنی سابقہ غلطی کی معافی طلب کر رہا تھا۔''

اماں نے کہا۔'' مجھے یہ بتاؤ کیا تم اُس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

"ہاں اماں کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔ میں اور تمہارے بابا کوئی مناسب موقع دیکھ کر اُن لوگوں سے رشتے کی بات کرتے ہیں۔"

دوسرے دن اماں اور بابا میرا رشتا لے کر اُن کے گھر چلے گئے مگر ایک ہی گھنٹے کے اندر ناکام لوٹ آئے۔ چندا کی منگنی اُس کے بچپن میں کر دی گئی تھی۔ البتہ وہ لوگ فائزہ کا رشتا دینے کے لیے تیار تھے مگر اماں اور بابا نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ فائزہ اور راجا کی عمر میں بارہ تیرہ سال کا فرق ہے۔ قسمت ایک بار پھر میرے ساتھ ہاتھ کر گئی تھی۔

☆......☆......☆

فیصل نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ "راجا! تم چاہو تو یہ منگنی با آسانی ٹوٹ سکتی ہے؟"

فیصل میرا اسکول کے زمانے کا دوست تھا اور آج کل مقامی پولیس اسٹیشن میں اے ایس آئی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ بہت ہی دلیر اور یار باش قسم کا انسان تھا۔

میں نے پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں اور میرا کام، مجھے بس اُس کا اتا پتا بتا دو، نام کیا ہے، کام کیا کرتا ہے اور رہنے والا کہاں کا ہے؟"

"لیکن مجھے کچھ پتا تو چلے نا! کہ تم اُس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"یار! میں پولیس میں ہوں۔ اُسے اُٹھاؤں گا اور ذرا سی چھینٹی لگاؤں گا تو وہ فوراً رشتے سے دست بردار ہونے کا اعلان کر دے گا۔"

میں نے کہا۔ "وہ جہاں رہتا ہے وہ علاقہ تمہارے تھانے کی حدود سے باہر ہے۔ تم اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گے؟"

وہ بولا۔ "تم یہ تو مانتے ہو نا! کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں؟"

"بے شک مانتا ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر بے فکر ہو جاؤ، اُس کے علاقے میں ٹرانسفر کرانا میرے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں سوچوں گا۔''

''سوچنے والے کبھی فیصلہ نہیں کر پاتے۔'' اُس نے قہقہہ لگایا۔ ''اُسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو پھر سوچو مت۔''

''میں جلد ہی کوئی فیصلہ کرلوں گا۔ تم بس چند دن صبر کرلو۔''

''ٹھیک ہے بھئی! جیسے تمہاری مرضی۔ ہم تو یاروں کے یار ہیں۔ جب بھی حکم کروگے سر کے بل چلے آئیں گے۔'' اُس نے اجازت طلب انداز میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''بیٹھو کھانا کھا کر چلے جانا۔''

''نہیں یار!'' اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری ڈیوٹی کا ٹائم ہونے والا ہے۔ کھانا پھر کسی دن سہی۔ اوکے خداحافظ۔''

فیصل کے جانے کے بعد میں نے سٹوڈیو کا گلی والا دروازہ اندر سے بند کیا اور سیدھا اماں کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے راجا؟'' اماں نے میری بے وقت آمد کے بارے میں استفسار کیا۔

میں نے کہا۔ ''اماں جس لڑکے کے ساتھ چندا کی منگنی ہوئی ہے۔ کیا آپ اُسے جانتی ہیں؟''

''ہاں جانتی ہوں مگر تمہیں اُس سے کیا کام ہے؟'' اماں نے مشکوک انداز میں پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں اماں! بس ایسے ہی اُسے دیکھنا چاہتا تھا۔ کہ وہ کون خوش قسمت ہے جسے چندا جیسی خوبرو لڑکی کا ساتھ ملنے والا ہے؟''

''راجا! بیٹے کیوں کرتے ہو یہ پیار؟ تمہاری قسمت ہی کھوٹی ہے۔ جسے چاہتے ہو وہی منہ پھیر کر چل دیتی ہے۔''

میں نے لبوں پر ایک زخمی سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔ ''اماں! پیار تو پیار ہوتا ہے کوئی بھی جان بوجھ کر نہیں کرتا۔ یہ تو بس ہو جاتا ہے۔''

اماں نے کہا۔ ''اسی لیے تو کہتی ہوں کہ تم کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کرلو۔ کب تک یوں ہی پھرتے رہوگے؟''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اماں! میں سوچوں گا۔ فی الحال تو آپ مجھے اُس لڑکے کے بارے میں بتادیں۔

وہ ون ہے، اُس کا نام اور پتا وغیرہ کیا ہے؟''

''مجھے لگتا ہے تم کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنا چاہتے ہو؟''

''قسم سے اماں! ایسی کوئی بھی بات نہیں ہے۔ میں بس ویسے ہی یہ دیکھنے کے لیے اُس سے ملنا چاہتا ہوں کہ وہ چندا کے قابل بھی ہے یا نہیں؟''

اماں نے تھوڑے سے تردد کے بعد مجھے اُس لڑکے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ اُس کا نام یاسر تھا اور وہ چندا کا محلے دار تھا۔ شہر کی ایک معروف مارکیٹ میں وہ ریڈی میڈ گارمنٹس کا کاروبار کرتا تھا۔ مجھے یہ معلومات اب فیصل تک پہنچانی تھیں مگر اس سے قبل میں چندا سے دوٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔

تین دنوں کے بعد آخر کار مجھے چندا سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ وہ ہمارے گھر میں اماں سے کوئی چیز مانگنے کے لیے آئی تھی اور خوش قسمتی سے اماں اُس وقت گھر میں موجود نہیں تھیں۔

''آنٹی کہاں ہیں؟'' اُس نے آتے ہی روکھے انداز میں سوال کیا۔

میں نے کہا۔ ''پڑوسیوں کے ہاں گئی ہوئی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر تک آجائیں گی۔''

''ٹھیک ہے تو میں پھر آجاؤں گی۔'' وہ واپسی کے لیے پلٹی۔

''ٹھہرو چندا! میری بات سنو۔'' میں ملتمس ہوا۔

''جی فرمایئے۔'' وہ بے تاثر انداز میں بولی۔ ''کیا مسئلہ ہے آپ کا؟''

میں نے کہا۔ ''چندا! میں تم سے بے حد پیار کرتا ہوں اور تم سے شادی.............''

''لیکن میں تو آپ سے پیار نہیں کرتی۔'' اُس نے قطع کلامی کی۔

''تو کیا یاسر سے کرتی ہو؟'' میں نے دل پر جبر کرتے ہوئے پوچھا۔

''کسی سے بھی نہیں کرتی۔ میرے پاس ایسے فضول کاموں کے لیے ٹائم ہی نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پلیز چندا! مجھے یوں نہ دھتکارو، میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتا۔''

وہ بولی۔ ''شہیر صاحب! یہ آپ کا مسئلہ ہے میرا نہیں ہے۔ آئندہ مجھ سے کبھی اس موضوع پر بات مت کرنا۔ میں آپ کا بہت احترام کرتی ہوں۔ یہ نہ ہو کہ میں کوئی گستاخی کر بیٹھوں؟''

ایک دم میری آنکھیں چھلکنے لگیں۔ اُس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی اور پھر کرب کے عالم میں منہ پھیر لیا۔
میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔" جاؤ چاند! مجھے تم سے کوئی گلہ نہیں ہے۔ شاید کسی کا پیار بھی میری قسمت میں نہیں ہے۔ جو بھی ملتی ہے وہی بے وفا نکلتی ہے۔"
وہ پلٹی اور پھر تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی میں گیٹ کی طرف چل دی۔

☆......☆......☆

یہ چندا سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد وہ لوگ دوبارہ شہر شفٹ ہو گئے۔ کیونکہ استانی صاحبہ کا شہر کے سکول میں ٹرانسفر ہو گیا تھا۔ ہفتے میں ایک بار شہر جا کر میں اُن کے گھر کا چکر ضرور لگاتا تھا۔ فائزہ سے بدستور میری دوستی قائم تھی۔ البتہ چندا نے اب میرے سامنے آنا چھوڑ دیا تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے چار سال کا عرصہ بیت گیا۔ فائزہ اب سیکنڈ ایئر کر رہی تھی جب کہ چندا گریجویشن کرنے کے بعد فارغ ہو چکی تھی۔ میری عمر بھی اب تیس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ چنانچہ اماں ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ وہ اُٹھتے بیٹھتے میری شادی کا ذکر کرتی رہتی تھیں۔ بابا بھی اماں کی تائید میں میری شادی پر زور دیتے رہتے تھے۔ لیکن میری ایک ہی رٹ تھی کہ شادی کروں گا تو چندا سے ورنہ زندگی بھر یونہی کنوارا بیٹھا رہوں گا۔
پھر ایک دن بابا نے شہر جا کر ڈاکٹر کمال سے ملاقات کی اور اپنی پگڑی اُتار کر اُس کے قدموں میں رکھ دی۔ ڈاکٹر کا دل پسیج گیا اور اُنھوں نے بابا کو رشتے کی ہاں کر دی۔ اُس کے بعد ڈاکٹر نے نجانے کیا چکر چلایا کہ یاسر نے خود ہی چندا سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔
گھر میں میری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میں بے حد خوش تھا۔ اماں اور بابا بھی ہر وقت مسکراتے رہتے تھے۔ اُنھوں نے مل کر چندا کے لیے ایسا ایسا سامانِ جہیز اور جیولری خریدی کہ گاؤں کی خواتین حیران رہ گئیں۔ بابا نے تجوری کا منہ کھول دیا تھا۔ جو بھی سوالی آتا وہ خالی ہاتھ نہ جاتا۔ آخر کار وہ روزِ سعید بھی آ گیا جب میری برات بڑی دھوم دھام کے ساتھ گاؤں سے نکلی اور خوشی کے شادیانے بجاتے بجاتے شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ ڈاکٹر کمال اور اُس کے رشتے داروں نے دل کھول کر برات کا استقبال کیا۔ کھانے کا شاندار انتظام کیا گیا تھا۔ نکاح کی تقریب براتیوں کو کھانا کھلانے کے بعد رکھی گئی تھی۔

سہ پہر اڑھائی بجے کے بعد جب تمام براتی کھانے کھا چکے تو تب نکاح خواں کو بلایا گیا۔ نکاح کی تقریب ابھی شروع ہونے ہی والی تھی کہ اچانک ہی ڈاکٹر کمال کے گھر سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرا دل کسی انجانے خدشے سے بے اختیار دھڑک اُٹھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہاں کہرام مچ گیا۔ کسی عورت نے آ کر ڈاکٹر کمال کو بتایا کہ دلہن نے زہر کھا لیا ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے دل کی دھڑکن رک سی گئی ہو۔ ڈاکٹر کمال بدحواس ہو کر گھر کی طرف بھاگا تو میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ عورتوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے ہم چندا تک پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے فوراً اُس کی نبض چیک اور پھر باری باری دونوں آنکھیں کھول کر دیکھیں۔

میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”انکل! آپ وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ہم اسے ہاسپٹل لے چلتے ہیں۔“ اُس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور پھر کسی بچے کے مانند پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”انکل!“ میں پاگلوں کی طرح چلایا۔ ”ہٹ جائیں میں اسے ہاسپٹل لے جاتا ہوں۔ پلیز ہٹ جائیں۔“

”راجا! تم......تم......پھر......ہار گئے ہو......یہ اب وہاں......پہنچ گئی ہے......جہاں سے کوئی لوٹ کر واپس نہیں آتا۔“ اُس نے بمشکل بات مکمل کی اور دوبارہ رونے لگا۔

”نہیں......نہیں......نہیں......“ میں ہذیانی انداز میں چلایا اور پھر میرا ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔



مجھے جب دوبارہ ہوش آیا تو میں نے خود کو ہاسپٹل کے سفید بستر پر موجود پایا۔ اماں، بابا اور ڈاکٹر کمال میرے بستر کے گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر اماں اور بابا کے مرجھائے ہوئے چہرے کھل اُٹھے۔

اماں بولیں۔ ”خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا ہے۔ تم پورے تین دن بے ہوش رہے ہو؟“

”اماں! وہ......وہ چندا......میں............“

شدتِ غم سے آواز میرے حلق میں اٹک کر رہ گئی اور آنکھیں بے اختیار برسنے لگیں۔ کتنی ہی دیر تک میں روتا رہا۔ اور وہ چپ چاپ میری طرف دیکھتے رہے۔ جب غم کا بوجھ قدرے ہلکا ہو گیا تو ڈاکٹر کمال نے جیب سے

ایک تہہ شدہ کاغذ نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

''یہ کیا ہے انکل؟'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

وہ بولا۔''یہ وہ خط ہے جو اُس بدقسمت کی مُٹھی میں دبا ہوا ملا ہے۔''

میں نے کاغذ کی تہیں کھول کر تحریر پر نظر ڈالی۔ لکھا تھا۔

''جان سے پیارے راجا آداب! تمہیں ہمیشہ مجھ سے یہی گلہ رہا ہے نا! کہ میں تم سے پیار نہیں کرتی۔ تو سنو آج میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں نے صرف اور صرف تمہی سے پیار کیا ہے۔ مجھے دراصل غصہ اُس یاسمین پہ آتا تھا جو مجھ سے پہلے ہی تمہاری زندگی میں آ گئی تھی۔ ہاں راجا! میں تم سے پاگل پن کی حد تک پیار کرتی ہوں۔ تمہارے بنا میں جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ لیکن ہائے ری قسمت کہ میں تمہاری ہوتے ہوئے بھی تجھے نہیں پا سکتی۔ کاش فائزہ نے یہ بات مجھے پہلے بتا دی ہوتی کہ وہ بھی تمہیں چاہتی ہے تو میں کبھی بھی تم سے شادی کرنے کی حامی نہ بھرتی۔ راجا! فائزہ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ میں اُس کی خوشیوں پہ ڈاکا نہیں ڈال سکتی۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا کہ میں تجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر اُس اَن دیکھی نگری میں جا رہی ہوں، جہاں سے لوٹ کر کوئی بھی واپس نہیں آتا۔ جاتے جاتے تم سے صرف اتنی التجا کروں گی کہ میرے بعد فائزہ کو اپنا لینا۔ وہ تمہیں بہت چاہتی ہے۔ تمہارے بغیر وہ مر جائے گی۔ پلیز! اسے میری پہلی اور آخری خواہش سمجھنا۔ میں نے زندگی میں کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا، لیکن آج اپنی بہن کی خوشیوں کی خاطر تم سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی ہوں کہ فائزہ کو ٹھکرانا مت ورنہ میری روح ہمیشہ بے چین رہے گی۔ فقط تمہاری بدنصیب چندا۔''

خط پڑھ کر میرے جسم میں سنسنی کی ایک تیز لہر دوڑ گئی۔ خط کے ابتدائی چند جملے چندا کے تحریر کردہ تھے۔ جب کہ بقیہ خط فائزہ کا تحریر کردہ تھا۔ فائزہ مجھ سے چار سال ٹیوشن پڑھتی رہی تھی۔ میں اُس کی ہینڈ رائٹنگ کو با آسانی پہچان سکتا تھا۔ اچانک ایک خیال برق کے کوندے کی طرح میرے دماغ میں لہرایا اور دوسرے ہی لمحے میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

''انکل! یہ خط تو فائزہ کی ہینڈ رائٹنگ میں ہے۔ سوائے ابتدائی چند جملوں کے؟''

''ہاں راجا! یہ خط اُسی بدقسمت کا ہے۔ جس نے اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کی جان لے لی ہے۔ کاش

میں اُسے کچھ کہہ سکتا؟'' ڈاکٹر کمال نے جگر پاش لہجے میں جواب دیا اور میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔

''انکل! یہ.........یہ.........آپ کیا.......کہہ رہے ہیں؟'' میں نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔'' فائزہ بھلا ایسا کیسے کرسکتی ہے؟.......میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''وہ اب کسی کو بھی نہیں پہچانتی بیٹے۔'' بابا بولے۔'' پاگل ہوگئی ہے بچاری، بس سارا سارا دن خود سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ تم اُسے دیکھو گے تو رو دو گے۔''

''یہ کیسی پریت کی ریت ہے ابا جی؟'' میں بے اختیار رونے لگا۔

''راجا بیٹے! محبت کے ہزاروں روپ ہوتے ہیں اور ہر روپ دوسرے سے نرالا ہوتا ہے۔''

بابا نے سر جھکا کر جواب دیا اور پھر رومال نکال کر اپنی بھیگی پلکیں صاف کرنے لگے۔

